منٹو
کے گم شدہ اور غیر مطبوعہ
افسانے
مرتب:
بلراج مینرا
سعادت حسن منٹو

منٹو

کے گم شدہ اور غیر مطبوعہ

افسانے

● بلراج مینرا

بلراج مینرا کی مرتب کردہ

دستاویز: منٹو

بھی دستیاب ہے

MANTOO Ke Goom Shuda Aur Ghair Matbooae **AFSANE** *(Fiction)*
Compiled By **BALRAJ MENRA**. *Price Rs 75 /=*

تلاش و جستجو:
بلراج مینرا

اشاعت : جون ۱۹۹۲ء
قیمت : پچھتر روپے
کتابت : ایم۔ حمران اعظمی
طباعت : اے ون آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی
سرورق : خان ارشد

زیر اہتمام:
پریم گوپال متّل

ناشر :

MODREN PUBLISHING HOUSE
9, Gola Market, Darya Ganj, New-Delhi 110002

سعادت حسن منٹو کے تعلق سے بلراج مینرا صاحب کا نام سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ مینرا صاحب نے موڈرن پبلشنگ ہاؤس کے لیے "منٹو کے گم شدہ اور غیر مطبوعہ افسانے" اپنی تحقیق و جستجو سے جمع کیے ہیں۔ معاہدے پر ۱۷/ جنوری ۱۹۹۰ء کو دستخط کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا تھا کہ وہ ان افسانوں پر مبسوط اور جامع دیباچہ بھی لکھ کر دیں گے۔ لیکن اس دوران "دُور درشن" پر ان کی مصروفیات اس قدر بڑھ گئیں کہ اب تک موصوف دیباچہ لکھ نہیں سکے۔ اب مجبوراً کتاب کو دیباچے کے بغیر شائع کیا جا رہا ہے۔ اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ قارئین مینرا صاحب کی تلاش و جستجو کی داستان پڑھنے سے محروم رہیں گے۔

پریم گوپال متل
پروپرائٹر۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹/ جون ۱۹۹۲ء

سبز سینڈل

"آپ سے اب میرا نباہ بہت مشکل ہے... مجھے طلاق دے دیجیے۔"

"لاحول ولا، کیسی باتیں منہ سے نکال رہی ہو... تم میں سب سے بڑا عیب ایک یہی ہے کہ وقتاً فوقتاً تم پر ایسے دَورے پڑتے ہیں کہ ہوش و حواس کھو دیتی ہو۔"

"آپ تو بڑے ہوش و حواس کے مالک ہیں... چوبیس گھنٹے شراب کے نشے میں دھت رہتے ہیں۔"

"میں شراب ضرور پیتا ہوں، لیکن تمھاری طرح بن پیے مدہوش نہیں رہتا... واہی تباہی نہیں بکتا۔"

"گویا میں واہی تباہی بک رہی تھی۔"

"یہ میں نے کب کہا... لیکن تم خود سوچو، یہ طلاق لینا کیا ہے۔"

"بس، میں لینا چاہتی ہوں... جس خاوند کو اپنی بیوی کا ذرا بھر خیال نہ ہو، اُس سے طلاق نہ مانگی جائے تو اور کیا مانگا جائے۔"

"تم طلاق کے علاوہ اور سب چیزیں مجھ سے مانگ سکتی ہو۔"

"آپ مجھے دے ہی کیا سکتے ہیں"
"ایک نیا الزام تم نے مجھ پر دھرا ہے۔۔۔ تمھاری ایسی خوش نصیب عورت اور کون ہوگی"
"لعنت ہے ایسی خوش نصیبی پر"
"لعنت نہ بھیجو۔۔ معلوم نہیں، تم کس بات پر ناراض ہو، لیکن میں تمھیں خلوصِ دل سے یقین دلاتا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے"
"خدا مجھے اس محبت سے پناہ دے"
"اچھا، چھوڑو ان جلی کٹی باتوں کو۔۔۔ بتاؤ، بچیاں اسکول چلی گئیں؟"
"آپ کو ان سے کیا دلچسپی ہے۔۔۔ اسکول جائیں یا جہنم میں۔۔۔ میں تو دعا کرتی ہوں، مر جائیں"
"کسی روز تمھاری زبان مجھے جلتے چمٹے سے باہر کھینچنا پڑے گی۔۔۔ شرم نہیں آتی کہ اپنی اولاد کے لیے ایسی بکواس کر رہی ہو"
"میں نے کہا، میرے ساتھ ایسی بدکلامی نہ کیجیے۔۔۔ شرم آپ کو آنی چاہیے کہ ایک عورت سے، جو آپ کی بیوی ہے اور جس کا احترام آپ پر فرض ہے، آپ بازاری انداز میں گفتگو کر رہے ہیں۔۔۔ اصل میں یہ سب آپ کی بُری سوسائٹی کا قصور ہے"
"اور جو تمھارے دماغ میں خلل ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟"
"آپ، اور کون؟"
"قصوروار ہمیشہ تم مجھے ہی ٹھہراتی ہو۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا تمھیں کیا ہوگیا ہے"
"مجھے کیا ہوا ہے۔۔۔ ہوا ہے تو صرف آپ ہوئے ہیں۔۔۔ ہر وقت میرے سر پر سوار رہتے ہیں۔۔۔ میں آپ سے کہہ چکی ہوں، مجھے طلاق دے دیجیے"
"کیا دوسری شادی کرنے کا ارادہ ہے۔۔۔ مجھ سے اکتا گئی ہو"
"تھو ہے آپ پر۔۔۔ مجھے کوئی ایسی ویسی عورت سمجھا ہے؟"
"تو پھر طلاق لے کر کیا کرو گی؟"
"جہاں سینگ سمائے، چلی جاؤں گی۔۔۔ محنت مزدوری کروں گی۔۔۔ اپنا اور اپنی بچیوں کا پیٹ پالوں گی"
"تم محنت مزدوری کیسے کرو گی۔۔۔ صبح نو بجے اٹھتی ہو، ناشتہ کرکے پھر لیٹ جاتی ہو، دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کم از کم تین گھنٹے سوتی ہو۔۔۔ خود کو دھوکا تو نہ دو"
"جی ہاں، میں تو ہر وقت سوئی رہتی ہوں اور آپ ہیں کہ ہر وقت جاگتے رہتے ہیں۔۔۔ ابھی کل ہی آپ کے دفتر سے ایک آدمی آیا تھا، وہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے افسر صاحب کو جب دیکھو، میز پر سر رکھے اونگھ رہے ہوتے ہیں"
"کون تھا آدمی وہ؟"

"آپ اپنی زبان درست کیجیے۔"

"بھئی مجھے تاؤ آگیا تھا۔ ۔ ۔غصّے میں آدمی کو اپنی زبان پر قابو نہیں رہتا۔"

"مجھے آپ پر اتنا غصّہ آرہا ہے، لیکن مَیں نے ایسا کوئی غیر مہذب لفظ استعمال نہیں کیا۔ ۔ ۔ انسان کو ہمیشہ دائرۂ تہذیب میں رہنا چاہیے۔ ۔ ۔ مگر یہ سب آپ کی بُری سوسائٹی کی وجہ ہے، جو آپ ایسے الفاظ اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔"

"مَیں تم سے پُوچھتا ہوں، میری بُری سوسائٹی کون سی ہے؟"

"وہ کون ہے، جو خود کو کپڑے کا بہت بڑا تاجر کہتا ہے۔ ۔ ۔ اُس کے کپڑے کبھی آپ نے ملاحظہ کیے۔ ۔ ۔ بڑی ادنیٰ قسم کے اور وہ بھی مَیلے چکٹ۔ ۔ ۔ یُوں تو وہ بی۔ اے۔ ہے، لیکن اُس کے عادات واطوار، اُٹھنا بیٹھنا ایسا واہیات ہے کہ گھن آتی ہے۔"

"وہ مردِ مجذوب ہے۔"

"یہ کیا بَلا ہوتی ہے؟"

"تم نہیں سمجھو گی۔ ۔ ۔ مجھے بیکار وقت ضائع کرنا پڑے گا۔"

"جی ہاں، آپ کا وقت بڑا قیمتی ہے۔ ۔ ۔ ذرا سی بات کرنے سے بھی ضائع ہو جاتا ہے۔"

"تم اصل میں کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"مَیں کچھ کہنا نہیں چاہتی۔ ۔ ۔ جو کہنا تھا، وہ کہہ دیا۔ ۔ ۔ بس مجھے طلاق دے دیجیے، تاکہ میری جان چھُٹے۔ ۔ ۔ ان ہر روز کے جھگڑوں سے میری زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔"

"تمھاری زندگی تو محبّت سے بھرے ہوئے ایک گھلے سے اجیرن ہو جاتی ہے۔ ۔ ۔ اِس کا کیا علاج ہے؟"

"اِس کا علاج، صرف طلاق ہے۔"

"تو بُلاؤ کسی مولوی کو۔ ۔ ۔ تمھاری اگر یہی خواہش ہے تو مَیں انکار نہیں کروں گا۔"

"مَیں کہاں سے بُلاؤں مولوی کو۔"

"بھئی طلاق تم چاہتی ہو۔ ۔ ۔ اگر مجھے لینا ہوتی تو مَیں دس مولوی چٹکیوں میں پیدا کر لیتا۔ ۔ ۔ مجھ سے تمھیں اِس سلسلے میں کسی مدد کی توقع نہیں کرنا چاہیے۔ ۔ ۔ تم جانو، تمھارا کام جانے۔"

"آپ میرے لیے اتنا کام بھی نہیں کر سکتے؟"

"جی نہیں۔"

"آپ تو اب تک یہی کہتے آئے ہیں کہ آپ کو مجھ سے بے پناہ محبّت ہے۔"

"درست ہے۔ ۔ ۔ رفاقت کی حد تک۔ ۔ ۔ مفارقت کے لیے نہیں۔"

"تو مَیں کیا کروں؟"

"جو جی میں آئے کرو... اور دیکھو، مجھے اب زیادہ تنگ نہ کرو... کسی مولوی کو بلوالو کہ وہ طلاق نامہ لکھ دے... میں اُس پر دستخط کردوں گا۔"

"حق مہر کا کیا ہوگا؟"

"طلاق چونکہ تم خود طلب کر رہی ہو، اِس لیے اُس کے مطالبے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"واہ جی واہ!"

"تمھارے بھائی بیرسٹر ہیں۔ اُن کو خط لکھ کر پوچھ لو... جب عورت طلاق چاہے تو وہ اپنا حقِ مہر طلب نہیں کرسکتی۔"

"تو ایسا کیجیے کہ آپ مجھے طلاق دے دیں۔"

"میں ایسی بیوقوفی کیوں کرنے لگا... مجھے تو تم سے پیار ہے۔"

"آپ کے یہ چونچلے مجھے پسند نہیں... پیار ہوتا تو مجھ سے ایسا سلوک کرتے؟"

"تم سے میں نے کیا بدسلوکی کی ہے؟"

"جیسے آپ جانتے ہی نہیں... ابھی پرسوں نرسوں کی بات ہے، آپ نے میری نئی ساڑھی سے اپنے جوتے صاف کیے تھے۔"

"خدا کی قسم، نہیں۔"

"تو پھر کیا فرشتوں نے کیے تھے؟"

"میں اتنا جانتا ہوں کہ آپ کی تینوں بچیاں اپنے جوتوں کی گرد آپ کی ساڑھی سے جھاڑ رہی تھیں... میں نے ان کو ڈانٹا بھی تھا۔"

"وہ ایسی بدتمیز نہیں ہیں۔"

"کافی بدتمیز ہیں، اس لیے کہ تم ان کو صحیح تربیت نہیں دیتی ہو... اسکول سے واپس آئیں تو اُن سے پوچھ لینا کہ وہ ساڑھی کا ناجائز استعمال کر رہی تھیں یا کہ نہیں۔"

"مجھے اُن سے کچھ پوچھنا نہیں ہے۔"

"تمھارے دماغ کو آج معلوم نہیں کیا ہوگیا ہے... اصل وجہ معلوم ہوجائے تو میں کوئی نتیجہ قائم کرسکوں۔"

"آپ نتیجے قائم کرتے رہیں گے، لیکن میں اپنا نتیجہ قائم کرچکی ہوں... بس آپ مجھے طلاق دے دیجیے... جب خاوند کو بیوی کا مطلق خیال نہ ہو، اُس کے ساتھ رہنے کا کیا فائدہ؟"

"میں نے ہمیشہ تمھارا خیال رکھا ہے۔"

"آپ کو معلوم ہے، کل عید ہے؟"

"معلوم ہے... کیوں... کل ہی تو میں بچیوں کے لیے نئے بُوٹ لایا ہوں، اوران کے فراکوں کے لیے میں نے آج سے آٹھ روز پہلے تمھیں ساٹھ روپے دیے تھے۔"

"یہ روپے دے کر آپ نے بڑا میرے باپ دادا پر احسان کیا۔"

"احسان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... آخر بات کیا ہے؟"

"بات یہ ہے کہ ساٹھ روپے کم تھے... تین بچیوں کے لیے آرگنڈی چالیس روپے میں آئی۔ فی فراک درزی نے سات روپے لیے... بتائیے آپ نے مجھ پر اور بچیوں پر کون سا کرم کیا۔"

"تو ایک روپیہ تم نے ادا کیا۔"

"ادا نہ کرتی تو فراک کیسے ملتے۔"

"تو یہ روپیہ مجھ سے ابھی لے لو... میرا خیال ہے، ساری ناراضی اسی بات کی تھی۔"

"میں کہتی ہوں، کل عید ہے۔"

"ہاں ہاں، مجھے معلوم ہے... میں دو مُرغ منگوا رہا ہوں... اس کے علاوہ سویّاں بھی... تم نے بھی کچھ انتظام کیا؟"

"میں خاک انتظام کروں گی۔"

"کیوں؟"

"میں چاہتی تھی، کل سبز ساڑھی پہنوں... سبز سینڈل کے لیے آرڈر دے آئی تھی... آپ سے کئی مرتبہ کہا کہ جائیے اور چینیوں کی دُکان سے دریافت کیجیے کہ وہ سینڈل ابھی تک بنی ہے یا نہیں... مگر آپ کو مجھ سے کوئی دلچسپی ہو تو آپ وہاں جاتے۔"

"لاحول ولا... یہ جھگڑا سارا سبز سینڈل کا تھا... جناب، آپ کی یہ سینڈل میں پرسوں ہی لے آیا تھا... آپ کی الماری میں پڑی ہے... آپ تو سارا وقت سوئی رہتی ہیں... آپ نے الماری کھولی ہی نہیں ہوگی... ..."

عقل داڑھ

"آپ منہ بنائے کیوں بیٹھے ہیں؟"

"بھئی دانت میں درد ہو رہا ہے۔۔ تم تو خواہ مخواہ۔۔۔"

"خواہ مخواہ کیا۔۔۔ آپ کے دانت میں کبھی درد ہو ہی نہیں سکتا!"

"وہ کیسے؟"

"آپ بھول کیوں جاتے ہیں کہ آپ کے دانت مصنوعی ہیں۔۔ جو اصلی تھے، وہ تو کبھی کے رخصت ہو چکے ہیں!"

"لیکن بیگم، بھولتی تم ہو۔۔۔ میرے بتیس دانتوں میں صرف نو دانت مصنوعی ہیں، باقی اصلی اور میرے اپنے ہیں۔ اگر تمھیں میری بات پر یقین نہ ہو تو میرا منہ کھول کر اچھی طرح معائنہ کر لو۔"

"مجھے یقین آگیا۔۔۔ آپ کی ہر بات پر مجھے یقین آجاتا ہے۔۔۔ پرسوں آپ نے مجھے یقین دلایا تھا کہ آپ سینما نہیں گئے تھے اور میں مان گئی تھی۔۔۔ پر آپ کے کوٹ کی جیب میں ٹکٹ پڑا تھا۔"

"وہ کسی اور دن کا ہوگا۔ میرا مطلب ہے، آج سے کوئی دو ڈھائی مہینے پہلے کا، جب میں کسی دوست کے

ساتھ پکچر دیکھنے چلا گیا تھا۔۔ ورنہ تم جانتی ہو، مجھے فلموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔۔ تم تو خیر ہر فلم دیکھتی ہو۔"

"خاک۔۔۔ مجھے فرصت ہی کہاں ہوتی ہے۔"

"فرصت ہی فرصت ہے۔۔۔ بچیوں کو صبح اسکول بھیج دیا۔۔۔ پھر سارا دن تم کیا کرتی ہو۔۔۔ نوکران کو اسکول سے لے آتا ہے۔ کھانا کھلا دیتا ہے۔۔۔ تم یا تو اپنی کسی سہیلی یا رشتے دار کے ہاں چلی جاتی ہو، یا میٹنی شو دیکھنے۔۔۔ شام کو پھر دورہ پڑتا ہے اور تم چلی جاتی ہو پھر کوئی اور فلم دیکھنے۔"

"یہ سفید جھوٹ ہے۔"

"یہ سفید ہے نہ کالا، حقیقت ہے۔"

"آپ کے دانت کا درد بھی کیا حقیقت ہے۔۔۔ چٹاخ پٹاخ باتیں کر رہے ہیں۔"

"سب سے بڑا درد تو تم ہو۔۔۔ اس کے سامنے دانت کا درد کیا حقیقت رکھتا ہے۔"

"تو آپ نے جس طرح اپنے دانت نکلوائے تھے، اسی طرح مجھے بھی نکال باہر پھینکیے۔"

"مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔۔۔ اس کے لیے بڑی جرأت کی ضرورت ہے۔"

"آپ جرأت کی بات نہ کریں۔۔۔ آپ کو مفت میں ایک نوکرانی مل گئی ہے، جو دن رات آپ کی خدمت کرتی ہے۔۔۔ اسے آپ برطرف کیسے کر سکتے ہیں۔"

"غضب خدا کا۔۔۔ تم نے دن رات میری کب خدمت کی ہے۔۔۔ پچھلے مہینے، مجھے جب نمونیا ہو گیا تھا تو تم مجھے بیماری کی حالت میں چھوڑ کر سیالکوٹ چلی گئی تھیں۔"

"وہ تو بالکل جدا بات ہے۔"

"جدا بات کیا ہے؟"

"مجھے، آپ کو معلوم ہے، اپنی عزیز ترین سہیلی نے بلایا تھا کہ اس کی بہن کی شادی ہو رہی تھی۔"

"اور یہاں جو میری بربادی ہو رہی تھی۔"

"آپ اچھے بھلے تھے۔۔۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھ لیا تھا۔۔۔ اس نے میری تشفی کر دی تھی۔۔۔ اس نے کہا تھا: "تشویش کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ نمونیا کا اٹیک کوئی اتنا سیریس نہیں۔ پھر پنسلین کے ٹیکے دیے جا رہے ہیں۔۔۔ انشاءاللہ دو ایک روز میں تندرست ہو جائیں گے۔"

"تم سیالکوٹ میں کتنے دن رہیں؟"

"یہی کوئی دس پندرہ دن۔"

"اس دوران میں تم نے مجھے کوئی خط لکھا، میری خیریت کے متعلق پوچھا؟"

"اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ آپ کو ایک سطر بھی لکھ سکتی۔"

"لیکن تم نے اپنی والدہ محترمہ کو چار خط لکھے۔"

"وہ تو بہت ضروری تھے۔"

"میں نے سب پڑھے ہیں۔"

"آپ نے کیوں پڑھے۔۔۔ یہ تو بہت بڑی بدتمیزی ہے۔"

"بدتمیزی میں نے نہیں کی۔۔۔ تمہاری والدہ محترمہ نے مجھے خود اُن کو پڑھنے کے لیے کہا، اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ کس قدر ضروری تھے۔"

"کیا ضروری تھے؟"

"بہت ضروری تھے، اس لیے کہ خاوند کے بھیجے ہوؤں کے مقابلے میں دلہن کے جہیز کی تفصیلات بہت اہم تھیں۔۔۔ اُس کے بالوں کی افشاں، اُس کے گالوں پر لگایا گیا غازہ، اُس کے ہونٹوں کی سُرخی، اُس کی زربفت کی قمیص، اور جانے کیا کیا۔۔۔ یہ تمام اطلاعیں پہنچانا واقعی اشد ضروری تھا، ورنہ دُنیا کے تمام کاروبار رُک جاتے، چاند اور سورج کی گردش بند ہو جاتی۔۔۔ دُلہن کے گھونگھٹ کے متعلق اگر تم نہ لکھتیں کہ کس طرح بار بار جھنجلا کر وہ اُسے اُٹھا دیتی تھی تو میرا خیال ہے، یہ ساری دُنیا ایک بہت بڑا گھونگھٹ بن جاتی۔"

"آج آپ بہت بھونڈی شاعری کر رہے ہیں۔"

"بجا ہے۔۔۔ تمہاری موجودگی میں اگر غالبؔ مرحوم بھی ہوتے تو وہ اسی قسم کی شاعری کرتے۔"

"آپ میری توہین کر رہے ہیں۔"

"تم نالش کر دو۔ مقدمہ دائر کر دو۔"

"میں ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہتی۔"

"تو پھر کن چکروں میں پڑنا چاہتی ہو۔ یہ تو بتا دو۔"

"آپ سے جو میری شادی ہوئی، بھلا اس سے بڑا چکر اور کیا ہو سکتا ہے۔۔۔ میرے بس میں ہو تو میں اس سے نکل بھاگوں۔"

"تمہارے بس میں کیا کچھ نہیں۔۔۔ تم چاہو تو آج ہی اس چکر سے نکل سکتی ہو۔"

"کیسے؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں۔۔۔ تم ماشاء اللہ عقلمند ہو۔۔۔ کوئی نہ کوئی رستہ نکال لو، تاکہ یہ روز روز کی بک بک اور جھک جھک ختم ہو۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ خود یہ چاہتے ہیں کہ مجھے نکال باہر کریں۔"

"لاحول ولا۔۔۔ میں خود باہر جانے کے لیے تیار ہوں۔"

"کہاں رہیں گے آپ؟"

"کہیں بھی رہوں۔۔۔ کسی دوست کے ہاں کچھ دیر ٹھہر جاؤں گا، یا شاید کسی ہوٹل میں چلا جاؤں۔۔۔

اکیلی جان ہوگی۔۔۔ مَیں تو بھئی فٹ پاتھ پر بھی سو کر گزارہ کر سکتا ہُوں۔۔۔ کپڑے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔۔۔ ان کو کسی لانڈری کے حوالے کر دُوں گا۔ وہاں وہ اِس گھر کے مقابلے میں زیادہ محفوظ رہیں گے۔ شیشے کی الماریوں میں سجے رہیں گے۔۔۔ جب گئے، ایک سُوٹ نکلوایا، اُس کی دُھلائی یا ڈرائی کلیننگ کے پیسے ادا کیے اور خراماں خراماں۔۔۔"

"خراماں خراماں، کہاں گئے؟"

"کہیں بھی۔۔۔ لارنس گارڈن ہے، سینما ہیں، ریستوران ہیں۔ بس جہاں جی چاہا، چلے گئے۔۔۔ کوئی پابندی تو نہیں ہوگی اُس وقت۔"

"یہاں میں نے آپ پر کون سی پابندیاں عاید کر رکھی ہیں۔۔۔ کُھلے بندوں جو چاہے، کرتے ہیں۔۔۔ میں نے آپ کو کبھی ٹوکا ہے؟"

"ٹوکا تو نہیں ہے۔۔۔ لیکن میرا ہر بار ایسا جھٹکا کیا ہے کہ مہینوں طبیعت صاف رہی۔"

"اگر طبیعت صاف رہے تو اُس میں کیا قباحت ہے۔۔۔ طبیعت ہمیشہ صاف رہنی چاہیے۔"

"مانتا ہوں کہ طبیعت ہمیشہ صاف رہنی چاہیے۔ مگر طبیعت صاف کرنے والے کو اِتنا خیال ضرور مدِنظر رکھنا چاہیے کہ وہ ضرورت سے زیادہ صاف نہ ہو جائے۔"

"آپ کے دانت میں درد ہو رہا تھا؟"

"وہ درد اب دل میں چلا گیا ہے۔"

"کیسے؟"

"آپ کی گفتگو ہر قسم کے کرشمے کر سکتی ہے۔۔۔ داڑھ میں شدّت کا درد تھا، لیکن آپ خدا معلوم کیوں تشریف لے آئیں اور مجھ سے لڑنا شروع کر دیا کہ داڑھ کا درد، دِل میں منتقل ہو گیا۔"

"مَیں صرف یہ پوچھنے آئی تھی کہ آپ کا مُنہ کیوں سُوجا ہوا ہے۔۔۔ بس اتنی سی بات کا آپ نے بتنگڑ بنا دیا۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا آپ کس کھوپڑی کے انسان ہیں۔"

"کھوپڑی تو میری ویسی ہی ہے، جیسی تمہاری یا دوسرے اِنسانوں کی۔۔۔ تمھیں اِس میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے۔"

"فرق، ساخت کے متعلق کچھ محسوس نہیں ہوتا، لیکن مَیں یہ وثوق سے کہہ سکتی ہُوں کہ آپ کی کھوپڑی میں یقیناً کوئی نقص ہے۔"

"کس قسم کا؟"

"اب مَیں قسم کہاں بتا سکتی ہُوں۔۔۔ کسی ڈاکٹر سے پوچھیے۔"

"پُوچھ لُوں گا۔۔۔ لیکن اب میرے دِل میں درد ہو رہا ہے۔"

"یہ سب جھُوٹ ہے۔۔۔ آپ کا دِل بہت مضبُوط ہے۔"

"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

"آج سے دو برس پہلے جب آپ ہسپتال میں داخل ہوئے تھے، تو آپ کا ایکس رے لیا گیا تھا۔۔"

"مجھے معلوم نہیں۔"

"آپ کو تنا ہوش ہی کہاں تھا۔۔۔ مجھے آپ کوئی نرس سمجھ بیٹھے تھے۔ وہ عجیب عجیب باتیں کرنے لگے تھے۔"

"بیماری میں کی گئی ہر خطا معاف کر دینی چاہیے۔۔۔ تم کہتی ہو کہ مجھے ہوش ہی کہاں تھا تو بتاؤ، میں صحیح باتیں کیسے کر سکتا تھا۔"

"میں آپ کے دل کے متعلق کہہ رہی تھی۔۔ ہسپتال میں جب آپ کے پانچ چھ ایکس رے لیے گئے تو سب ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یہ شخص صرف اپنے مضبوط دل کی وجہ سے جی رہا ہے۔۔۔ اس کے گردے کمزور ہیں، اس کی انتڑیوں میں ورم ہے، اس کا جگر خراب ہے، لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا؟"

"انھوں نے یہ کہا تھا کہ یہ نہیں مرے گا، اس لیے کہ اس کے پھیپھڑے اور دل صحیح حالت میں ہیں۔"

"دل میں تو خیر تم بسی رہتی ہو۔۔۔ پھیپھڑوں میں معلوم نہیں، کون رہتا ہے؟"

"رہتی ہوگی آپ کی کوئی۔۔۔"

"کون؟"

"میں کیا جانوں؟"

"خدا کی قسم، تمھارے سوا میں نے کسی اور عورت کو آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا ہے۔"

"آنکھ جھکا کر دیکھا ہوگا۔"

"وہ تو خیر دیکھنا ہی پڑتا ہے، مگر کسی بُرے خیال سے نہیں۔۔۔ بس ایک نظر دیکھا اور چل دیے۔"

"لیکن ایک نظر دیکھنا کیا بہت ضروری ہے۔۔۔ کیا شریعت میں لکھا ہے؟"

"اس بحث کو چھوڑو۔۔۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کہنے کیا آئی تھیں۔۔۔ تمھاری عادت ہے کہ اپنا مطلب بیان کرنے سے پہلے تم جھگڑا ضرور شروع کر دیا کرتی ہو۔"

"مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا تھا۔"

"تو پھر آپ تشریف لے جائیے۔۔۔ مجھے دفتر کے چند کام کرنے ہیں۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔"

"تو پھر تم خاموش بیٹھی رہو۔۔۔ میں کام ختم کر لوں تو تھوڑا ہوں جلدی نکلنا ہے، بک لینا۔۔۔ میری داڑھ میں شدت کا درد ہو رہا ہے۔"

"میں کس لیے آپ کے پاس . . ."
"مجھے کیا معلوم؟"
"میری عقل داڑھ نکل رہی ہے . . ."
"خدا کا شکر ہے . . . تم کو اب کچھ عقل تو آجائے گی۔"
"بہت درد ہو رہا ہے . . ."
"کوئی بات نہیں . . . اِس درد ہی سے عقل آ رہی ہے۔"

سونورل

بشریٰ نے جب تیسری مرتبہ خواب آور دوا "سونورل" کی تیس ٹکیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی تو میں سوچنے لگا کہ آخر یہ سلسلہ کیا ہے —— اگر مرنا ہی ہے تو سنکھیا موجود ہے، افیم ہے۔ ان سمیات کے علاوہ اور بھی زہر ہیں جو بڑی آسانی سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ہر بار "سونورل" ہی کیوں کھائی جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خواب آور دوا زیادہ مقدار میں کھائی جائے تو موت کا باعث ہوتی ہے لیکن بشریٰ کا تین مرتبہ صرف اسے ہی استعمال کرنا ضرور کوئی معنی رکھتا تھا —— پہلے میں نے سوچا، چونکہ دو مرتبہ دوا کھانے سے اس کی موت واقع نہیں ہوئی، اس لیے وہ احتیاطاً اسے ہی استعمال کرتی ہے۔ اور اسے اپنے اقدام خودکشی سے جو اثر پیدا کرنا ہوتا ہے، موت کے ادھر اُدھر رہ کر کر لیتی ہے —— لیکن میں سوچتا تھا کہ وہ ادھر اُدھر بھی ہو سکتی تھی۔ یہ کوئی سو فی صدی محفوظ طریقہ نہیں تھا۔

تیسری مرتبہ جب اس نے تیس گولیاں کھائیں تو اس کے تیسرے شوہر کو، جو پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں اوورسیئر ہیں، صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب پتہ چلا کہ وہ فالج زدہ بھینس کی مانند بے حس و حرکت پلنگ پر پڑی ہے ——

اُس کو یہ خواب آور دوائیں دے غالباً تین چار گھنٹے ہو چکے تھے۔

اوور سیئر صاحب سخت پریشان اور لرزاں میرے پاس آئے ـــــ مجھے سخت حیرت ہوئی، اس لیے کہ بشریٰ سے شادی کرنے کے بعد وہ مجھے قطعاً بھُول چکے تھے۔ اس سے پہلے وہ ہر روز میرے پاس آتے اور ہم دونوں اکٹھے بیٹھ کر وسکی پیا کرتے تھے۔

اُن دنوں وہ مفلوک الحال تھے ـــ سائیکل پر دفتر جاتے اور اسی پر گھر واپس آتے ـــ مگر جب اُن کی بُشریٰ سے دوستی ہوئی اور وہ اُس سے شادی کر کے اُسے اپنے گھر لائے تو نقشہ ہی بدل گیا، اُن کا بھی اور اُن کے گھر کا بھی۔

اب وہ بہت عمدہ سُوٹ پہنتے تھے۔ سواری کے لیے موٹر بھی آگئی۔ گھر بڑھیا سے بڑھیا فرنیچر سے آراستہ ہو گیا۔ ریس کھیلنے لگے۔ دیسی رَم کی بجائے اب اسکاچ وسکی کے دَور اُن کے یہاں چلتے تھے ـــــ بشریٰ بھی پینے والی تھی، اس لیے دونوں بہت خوش رہتے تھے۔

اوور سیئر قمر صاحب کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ ہوگی ـــــ بشریٰ اُن سے غالباً پانچ برس بڑی تھی۔ کسی زمانے میں شاید اُس کی شکل وصُورت قابلِ قبول ہو، مگر اس عمر میں وہ بہت بھیانک تھی: چہرے کی جُھریوں والی کھال پر شوخ مَیک اَپ۔ بال کاٹے کیے ہوئے۔ بند بند ڈھیلا جیسے اوس میں پڑی ہوئی پتنگ۔ ڈھلکا ہوا پیٹ۔ انگیا کے کرنیوں سے اُوپر اُٹھائی ہوئی چھاتیاں۔ آنکھوں میں سُرمے کی بدخط تحریر ـــــ میں نے جب بھی اُس کو دیکھا، وہ مجھے نسوانیت کا ایک بھدّا کارٹون سا دکھائی دی۔

قمر صاحب نے، جیسا کہ ظاہر ہے، اُس میں اس کے سوا اور کیا خُوبی دیکھی ہوگی کہ وہ مالدار تھی۔ اُس کا باپ پنجاب کا ایک بہت بڑا زمین دار تھا، جس سے وراثت میں اُس کو بہت سی زمینیں ملی تھیں۔ اُن سے چھ سات سو روپیہ ماہوار کی مستقل آمدن ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ بینک میں بھی اُس کا دس پندرہ ہزار روپیہ موجود تھا ـــــ اور قمر صاحب؟ وہ ایک معمولی اوور سیئر تھے۔ بیوی تھی۔ چھ بچّے تھے جن میں دو لڑکے تھے، جو کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے ـــــ اُن کے گھر میں افلاس ہی افلاس تھا۔ ویسے شوقین مزاج تھے اور شاعر بھی۔ شام کو شراب بہت ضروری سمجھتے تھے ـــــ اس لیے آپ خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُن کے بال بچّوں کے لیے کیا بچتا ہوگا۔

قمر صاحب نے یُوں تو یہ ظاہر کیا کہ وہ بُشریٰ کو شرعی طور پر اپنے رشتۂ مناکحت میں لا چکے ہیں، لیکن مجھے شک تھا اور اب بھی ہے کہ محض ایک ڈھونگ تھا ـــــ قمر صاحب بڑے ہوشیار اور چالاک آدمی ہیں۔ اپنی زندگی کے پچپن برسوں میں نہ جانے کتنے پاپڑ بیل چکے ہیں۔ وہ سرد و گرم چشیدہ ہیں، گرگ باراں دیدہ ہیں، بشریٰ سے شادی کا جھنجھٹ پالنا کیسے منظور کر سکتے تھے۔

بُشریٰ سے شادی کر کے قمر صاحب کے گھر کی حالت بہت حد تک سُدھر گئی تھی۔ اُن کی تین بچیاں، جو سارا دن آوارہ پھرتی رہتی تھیں، عیسائیوں کے کسی اسکول میں داخل کرا دی گئی تھیں۔ اُن کی پہلی بیوی کے کپڑے

بھی صاف ستھرے ہوگئے تھے۔ کھانا پینا بھی اب عمدہ تھا۔

میں خوش تھا کہ چلو، اب ٹھیک ہے، دوسری شادی کی ہے، کچھ بُرا نہیں ہوا، بشریٰ کو ایک خاوند مل گیا ہے، جو باسلیقہ اور ہوشیار ہے اور قمر صاحب کو ایک ایسی عورت مل گئی ہے، جو بدصورت سہی مگر مالدار تو ہے۔

مگر ان کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک مستحکم نہ رہا، کیونکہ ایک روز سُننے میں آیا کہ اُن کے درمیان بڑے زوروں کا جھگڑا ہوا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں نے "سونورل" کافی مقدار میں کھالی۔ کمرے میں فرش پر قمر صاحب بے ہوش پڑے تھے اور اُن کی اہلیہ محترمہ پلنگ پر لاش کی مانند لیٹی تھیں۔

فوراً ان دونوں کو ہسپتال میں داخل کرایا گیا، جہاں سے وہ دوسرے روز ٹھیک ٹھاک ہو کر واپس آگئے۔ مگر ابھی پندرہ روز مشکل گزرے ہوں گے کہ پھر دونوں نے "سونورل" سے شغل فرمالیا۔ معلوم نہیں وہ ہسپتال پہنچائے گئے، یا گھر ہی میں اُن کا علاج ہوا، بہرحال بچ گئے۔ اس کے بعد غالباً ایک برس تک ان کے یہاں ایسا کوئی حادثہ پیش نہ آیا، لیکن ایک روز علی الصبح مجھے پتہ چلا کہ بشریٰ نے "سونورل" کی تیس ٹکیاں کھالی ہیں۔

قمر صاحب سخت پریشان اور مضطرب تھے۔ اُن کے حواس باختہ تھے ـــــ میں نے فوراً ہسپتال ٹیلی فون کیا اور ایمبولنس گاڑی منگوائی۔ بشریٰ کو وہاں پہنچایا گیا۔ ہاؤس سرجن پینے کو رٹم میں تھے۔ میں نے اُن کو وہاں سے نکالا اور سارا ماجرا سُنا کر جلدی ہسپتال چلنے کو کہا۔ اُن پر میری عجلت طلب درخواست کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بڑے بے رحم انداز میں کہنے لگے: "منٹو صاحب، مرنے دیجیے اس کو۔۔۔ آپ کیوں گھبرا رہے ہیں؟"

ان کو معلوم تھا کہ بشریٰ اس سے پیشتر دو مرتبہ زہر خوری کے سلسلے میں ہسپتال آچکی ہے ـــــ میں نے اُن سے بشریٰ کے بارے میں اور کچھ نہ پوچھا اور تھوڑی دیر کے بعد واپس گھر چلا آیا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے بشریٰ کا حدود اربعہ معلوم نہیں تھا، یا اس کی زندگی کے سابقہ حالات میرے علم سے باہر تھے ـــــ میری اس کی متعدد مرتبہ ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ مجھے "بھائی سعادت" کہتی تھی۔ اس کے ساتھ کئی دفعہ پینے پلانے کا اتفاق بھی ہو چکا تھا۔

اس کی ایک لڑکی پروین تھی۔ اس کی تصویر میں نے پہلی مرتبہ اس روز دیکھی جب وہ قمر صاحب کے گھر میں بحیثیت بیوی کے آئی۔ نیچے دو کمروں میں سامان وغیرہ سجایا جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک قبول صورت جوان لڑکی کا فوٹو معمولی سے فریم میں مینٹل پیس پر پڑا ہے۔

جب میرا کا دور چلا تو میں نے بشریٰ سے پوچھا کہ یہ فوٹو کس کا ہے۔۔۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کی لڑکی پروین کا ہے، جس نے خودکشی کرلی تھی۔ میں نے جب اس کی وجہ دریافت کی تو مجھے قمر صاحب اور بشریٰ سے جو باتیں معلوم ہوئیں، ان دو گھرانوں کے اندر [illegible] سے تو پتہ [illegible] قسم کی ہوں گی۔

پروین، بشریٰ کی پھوپھی کی لڑکی تھی، جو اس کے پہلے خاوند سے پیدا ہوئی۔ وہ بھی کافی دولت مند [illegible]

—— یہ مر گیا۔

مجھے دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا کہ بشریٰ کا یہ پہلا خاوند جس کا نام اللہ بخش تھا، اُس سے شادی کے چند برسوں بعد ہی سخت متنفر ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ اُس کی زندگی ہی میں بشریٰ نے کسی اور شخص سے آنکھ مٹکا شروع کر دی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بشریٰ کو اپنے خاوند کی نفرت و حقارت سے بچنے کے لیے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔ مرنے پر اللہ بخش نے بشریٰ کو ایک کوڑی نہ دی، لیکن اپنی پرویز کے لیے کچھ جائداد الگ کر دی۔

بشریٰ نے دوسری شادی کر لی۔ چونکہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال تھی، اس لیے پشاور کا ایک کامیاب بیرسٹر اس کے دام میں گرفتار ہو گیا۔ اس سے اُس کے یہاں دو بیٹے پیدا ہوئے۔ مگر اس دوسرے شوہر کے ساتھ بھی وہ زیادہ دیر تک جم کے نہ رہ سکی۔ چنانچہ اس سے طلاق حاصل کر لی —— دراصل وہ آزاد زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔

یہ بیرسٹر ابھی تک زندہ ہے۔ دونوں لڑکے جواب جوان ہیں، اُس کے پاس ہیں —— یہ اپنی ماں سے نہیں ملتے۔ اس لیے کہ اُس کا کردار انھیں پسند نہیں۔

یہ تو ہے بشریٰ کی زندگی کا مختصر خاکہ۔ اس کی بیٹی پرویز کی کہانی ذرا طویل ہے۔

اُس کا بچپن زیادہ تر دیہات کی کھلی فضاؤں میں گزرا۔ بڑی نرم و نازک بچی تھی۔ سارا دن سرسبز کھیتوں میں کھیلتی رہتی۔ اُس کا ہمجولی کوئی بھی نہ تھا۔ مزارعوں کے بچوں سے میل جول اُس کے والدین کو پسند نہیں تھا۔ جب وہ کچھ بڑی ہوئی تو اُسے لاہور کے ایک ایسے اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں داخل کر دیا گیا، جہاں بڑے بڑے امیروں کے بچے پڑھتے تھے۔

ذہین تھی۔ طبیعت میں جوہر تھا۔ جب اسکول سے نکل کر کالج میں داخل ہوئی تو وہ ایک خوب صورت دوشیزہ میں تبدیل ہو چکی تھی، جس کا مضطرب دل و دماغ ہر وقت کسی نہ کسی آئیڈیل کی تلاش میں رہتا تھا۔ بہت سُریلی تھی۔ جب گاتی تو سُننے والے اُس کی آواز سے مسحور ہو جاتے۔ رقص بھی اس نے سیکھا تھا۔ ناچتی تو دیکھنے والے مبہوت ہو جاتے۔ اُس کے اعضا میں بلا کی لوچ تھی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب وہ ناچتی تو اس کے اعضا کی خفیف سے خفیف حرکت بھی دیکھنے والوں سے ہم کلام ہوتی تھی۔

بہت بھولی بھالی تھی۔ اُس میں وہی سادگی اور سادہ لوحی تھی، جو گاؤں کے اکثر باشندوں میں ہوتی ہے۔ انگریزی اسکول میں پڑھی تھی۔ کالج میں تعلیم حاصل کی تھی —— اُس کی سہیلیوں میں بڑی تیز، ہنس مکھ اور کائیاں لڑکیاں موجود تھیں، مگر وہ اُن سب سے الگ تھی۔ وہ بادلوں سے بھی اُوپر اُس فضا میں رہتی تھی، جو بڑی لطیف ہوتی ہے۔ اُس کو دھن دولت کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ ایک ایسے نوجوان کے خواب دیکھتی تھی، جس کو معبود بنا کر اُس کی ساری زندگی عبادت میں گزر جائے۔ عشق و محبت کی جائے نماز پر وہ مجسم سجدہ تھی۔

اس کی ماں اُسے [illegible] لے گئی تو وہاں [illegible] کی ملی جُلی محفل منعقد ہوئی [illegible]

پرویز

کو مجبور کیا گیا۔ وہ پتا رقص دکھائے۔ اُس نے حاضرین پر نگاہ دوڑائی۔ ایک خوش پوش پٹھان نوجوان دُور کونے میں کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر دمک تھی۔ ایک لمحے کے لیے پرویز کی نظریں اُس پر رُک گئیں۔ نوجوان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس سے کچھ کہا، اور پرویز، جو انکار کرنے والی تھی، سب کچھ بھُول کر بڑے دلفریب انداز میں رقص کرنے لگی۔

اس دوران میں اُس نے اپنے لچکیلے اور گداز جسم کے بھاؤ اور ہر رنگ سے اپنی رُوح کے اندر چھُپی ہوئی خواہشوں کو ایک ایک کر کے باہر نکالا اور اس پٹھان نوجوان کی متحیر اور مسحور آنکھوں کے سامنے ترتیب وار سجا دیا۔

اس نوجوان کا نام یوسف غلزئی تھا۔ اچھے دولت مند قبیلے کا ہونہار فرد تھا۔ فارغ التحصیل ہو کر اب بڑھ بڑھ کے مُلکی سیاسیات میں حصہ لے رہا تھا۔ عورت اُس کے لیے عجوبہ نہیں تھی، لیکن پرویز نے اسے موہ لیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دونوں کی شادی بڑے دھوم دھڑاکے سے ہوئی اور وہ میاں بیوی بن کر ایبٹ آباد میں رہنے لگے ——— پرویز بہت خوش تھی، اس قدر خوش کہ اُس کا جی چاہتا تھا، ہر وقت رقصاں رہے، ہر وقت اس کے ہونٹوں سے سہانے اور سہانے نو رنگین جشنوں کی طرح پھُوٹتے رہیں۔

وہ یوسف تھا پرویز اس کی زلیخا تھی۔ اُس کی عبادت میں دن رات مصروف رہتی۔ اُس نے اپنی طرف سے اس کے قدموں میں اپنی تمام نسائیت کا جوہر نکال کر ڈال دیا تھا ——— اس سے زیادہ کوئی عورت کیا کر سکتی ہے۔

شروع شروع میں وہ بہت خوش رہی، اتنی خوش اور مسرور کہ اسے یہ محسوس تک نہ ہوا کہ اس کو ازدواجی زندگی بسر کرتے ہوئے پُورے تین برس گزر چکے ہیں۔ اس کے ایک بچی ہوئی تھی، مگر وہ اپنے یوسف کی محبت میں اس قدر مستغرق تھی کہ وہ کبھی کبھی اس کے وجود سے بالکل غافل ہو جاتی تھی۔

عجیب بات ہے کہ جب یہ لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے یہ محسوس کیا کہ اس کے پیٹ سے بچی کے بجائے یُوسف نکلا ہے، اس کی محبت نے اُس کو جنم دیا ہے ——— اس سے آپ پرویز کی والہانہ محبت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

لیکن اس کے معبود کے قدم ثابت نہ رہے۔ وہ طبعاً عیش پرست تھا۔ وہ مصری کی مکھی کی طرح نہیں، شہد کی مکھی کی طرح باغ کی ہر کلی کا رس چوسنا چاہتا تھا۔ چنانچہ کروٹ بدل کر اور پرویز کی محبت کی زنجیریں توڑنے کے بعد وہ پھر اپنے پہلے مشاغل میں مصروف ہو گیا۔

اس کے پاس دولت تھی، جوانی تھی، پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ ملکی سیاسیات میں سرگرم حصہ لینے کے باعث اُس کا نام دن بدن روشن ہو رہا تھا۔ اس کو پرویز کی والہانہ محبت یکسوئی اب بے معنی دکھائی دی۔ وہ اس سے اُکتا گیا۔ ہر وقت کی [illegible] چاہت [illegible] کی کھینچا تانی اُس کو بہت کھلنے لگی۔ وہ نہیں چاہتا

تھا کہ پرویز اُسے مکھی کے مانند اپنی محبت کے جالے میں قید کرے۔ جہاں وہ مرونڈ ہو جائے۔ اس کے بعد وہ اُسے سفوف میں تبدیل کر کے نسوار کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دے۔

پرویز کو جب معلوم ہوا کہ یوسف سالم کا سالم اُس کا نہیں ہے تو اُسے سخت صدمہ ہوا۔ کئی دنوں تک وہ اس کے باعث گم سُم اور نڈھال رہی۔ اُس کو یوں محسوس ہوا کہ اُس کے آئیڈیل کو ہتوڑوں کی ظالم ضربوں نے چکنا چور کر کے ڈھیر کر دیا ہے۔

اُس نے یوسف سے کچھ نہ کہا۔ اُس کی بے اعتنائیوں اور بے وفائیوں کا کوئی گلہ نہ کیا۔ وہ کوئی حتمی فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ طویل عرصے تک تنہائیوں میں رہ کر اُس نے حالات پر غور کیا۔ یوسف سے چھٹکارا حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا، لیکن وہ اس کی جُدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اُس کو معبُود کا رتبہ دینے والی وہ خود تھی۔ خُدا کو اُس کا بندہ کیسے رد کر سکتا ہے، جب کہ وہ ایک بار صدق دل سے اُس کی خدائی تسلیم کر چکا ہے، اُس کے حضور ہر وقت سجدہ ریز رہا ہے۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یوسف کے نہیں، صرف اپنے اُس جذبے کی خاطر جس نے یوسف کو خدائی کا رتبہ بخشا تھا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُس کے ساتھ رہے گی۔ وہ اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت دینے کے لیے بھی تیار تھی۔

کہا جاتا ہے کہ اُس بے چاری نے یوسف کی آغوش کے لیے ہر اُس عورت کے لیے آسانیاں پیدا کیں، جو اُس میں تھوڑی دیر کے لیے حرارت محسوس کرنا چاہتی تھی۔ یہ بڑی بے غیرتی تھی، مگر اُس نے اپنے ٹوٹے ہوئے آئیڈیل کو مکمل شکست و ریخت سے بچانے کی خاطر فرار کا یہ عجیب و غریب راستہ اختیار کیا اور ہر قسم کی بے غیرتی برداشت کی۔

وہ اس کی چند روزہ محبوباؤں سے بڑے پیار و محبت سے پیش آتی۔ اُن کی خاطر تواضع کرتی۔ ان کی عصمت باختہ تلون مزاجیوں کو سر آنکھوں پر رکھتی، اور اُن کو اور اپنے خاوند کو ایسے موقعے بہم پہنچاتی کہ اس کی موجودگی ان کے عیش و عشرت میں مخل نہ ہو پاتی۔

اُن عورتوں کے لیے اپنے سینے پر پتھر رکھ کر وہ قسم قسم کے کھانے تیار کرتی۔ اُس کا خاوند اُن واہیات عورتوں کو خوش رکھنے کے لیے جب اُسے حکم دیتا کہ ناچے اور گائے تو وہ ضبط سے کام لے کر کسی بھی لمحے برس پڑنے والی بھیگی آنکھیں خشک کرتی، زخمی دل پر پھاہے لگاتی۔ غم و غصّے سے کانپتے ہوئے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹیں پیدا کرتی۔ مسرت و انبساط سے بھرے ہوئے گیت گاتی اور بڑے طربناک انداز میں رقص کرتی۔

اس کے بعد وہ تنہائی میں اس قدر روتی، اس قدر آہیں بھرتی کہ اُسے محسوس ہوتا کہ وہ اب نہیں جیے گی مگر ایسے طوفان کے بعد اُس میں ایک نئی قوت برداشت پیدا ہو جاتی تھی اور یوسف کی دلالی میں اپنا منہ کالا کرنا شروع کر دیتی تھی اور خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتی تھی کہ یہ کالک نہیں، بڑا ہی خوش رنگ غازہ ہے۔

اس دوران میں اُس کی ماں اُس سے ملنے کے لیے کئی مرتبہ آ چکی تھی، مگر اُس نے اپنے خاوند کے متعلق اُس

سے کبھی شکایت نہیں کی تھی۔ وہ اپنے راز یا دُکھ میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اِن حالات میں بھی وہ اپنے خاوند کی ذات کے ساتھ کسی اور کو کسی طریقے سے بھی وابستہ دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ یہ سوچتی کہ خاوند میرا ہے، اور وہ دُکھ بھی میرا ہے، جو وہ مجھے پہنچا رہا ہے، وہ اگر دوسری عورتوں کو بھی اِسی قسم کا دُکھ پہنچائے تو مجھے حسد ہوگا، لیکن وہ ایسا نہیں کرتا۔ اِس لیے میں خوش ہوں . . .

بشریٰ اُن دنوں فارغ تھی، یعنی اُس نے کوئی نیا شوہر نہیں کیا ہوا تھا۔ اُس کا وقت سیر و تفریح میں گزر رہا تھا۔ دس پندرہ دن ایبٹ آباد میں پرویز کے ساتھ رہتی، یوسف کے ساتھ اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے ـــــ جب بشریٰ آتی تو دوسری عورتوں سے ملاقات کا سلسلہ منقطع ہو جاتا۔ دونوں گھنٹوں علیحدہ کمرے میں بیٹھے تاش کھیلتے رہتے اور پرویز اُن کی خاطر تواضع میں مصروف رہتی ـــــ وہ چاہتی تھی کہ اُس کی ماں زیادہ دیر تک اُس کے پاس ٹھہرے تاکہ سوسائٹی کی اُن عورتوں کا، جو چکلے کی رنڈیوں سے بھی بدتر ہیں، اُس گھر میں داخلہ بند رہے۔ مگر اُس کی ماں ایک جگہ بہت عرصے تک ٹک کر رہ نہیں سکتی تھی جب وہ چلی جاتی تو دوسرے تیسرے روز یوسف پھر اپنی پُرانی ڈگر اختیار کر لیتا ـــــ پرویز دوسرا رُوپ دھار لیتی اور اپنے خاوند کی نت نئی سہیلیوں کے قدموں کے نیچے پا انداز بن جاتی۔

اُس نے اُس زندگی کو آہستہ آہستہ اپنا لیا تھا۔ اب اُسے زیادہ کوفت نہیں ہوتی تھی۔ اُس نے خود کو سمجھا بجھا کر راضی کر لیا تھا کہ اپنی زندگی کے ڈرامے میں اُسے وہی رول ادا کرنا تھا، جو وہ کر رہی ہے۔ چنانچہ اُس کے دل و دماغ سے وہ کدورت، جو پہلے پہل بہت اذیت دہ تھی، قریب قریب دُھل گئی تھی ـــــ وہ خوش رہتی تھی اور اپنی ننھی بچی کی طرف زیادہ توجّہ دینے لگی تھی۔

ایک دن اُسے کسی ضروری کام سے اچانک لاہور جانا پڑا ـــــ دو دن کے بعد لوٹی تو شام کا وقت تھا۔ یُوسف کا کمرہ بند تھا، مگر اس میں سے اُس کے مخمور قہقہوں کی آواز سُنائی دے رہی تھی ـــــ پرویز نے دروازے کی ایک درز سے اندر جھانک کر دیکھا اور سر تا پا لرز گئی۔ اس کا پیازی رنگ ایک دم کاغذ کے مانند بے جان سفیدی اختیار کر گیا۔

یہ سارے واقعات مجھے بڑے معتبر ذرائع سے معلوم ہوئے۔ بشریٰ نے مجھے جو کچھ بتایا، اُس سے مختلف تھا ـــــ اُس کا بیان ہے کہ پرویز دل ہی دل میں کُڑھ کُڑھ کر اپنی جان سے بیزار ہو گئی تھی۔ اُس نے یُوسف کی خاطر بڑی سے بڑی ذلت قبول کرنا گوارا تو کر لیا تھا، مگر اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ایک رات یُوسف نے شراب کے نشے میں بدمست اپنی کسی چہیتی کو آغوش میں لیے پرویز سے کہا کہ وہ ناچے اور ننگی ناچے۔ وہ اُس کے کسی حکم کو نہیں ٹالتی تھی۔ یوسف اُس کا خُدا تھا۔ چنانچہ اُس نے اُس کے حکم کی تعمیل کی۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور اس کا عُریاں بدن رقصاں تھا ـــــ ناچ ختم ہوا تو اُس نے خاموشی سے کپڑے پہنے اور باہر نکل کر زہر کھا لیا اور مر گئی۔

معلوم نہیں، حقیقت کیا تھی، لیکن جو کچھ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا، یہ ہے کہ جب پرویز نے یوسف کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ زندہ نہیں رہے گی ــــ

ــــ چنانچہ اسی وقت وہ موٹر میں سیدھی ایک کیمسٹ کی دکان پر گئی اور اس سے "سونورل" کی پوری ڈبیہ طلب کی۔ قیمت ادا کرنے لگی تو اسے معلوم ہوا کہ افراتفری کے عالم میں وہ اپنا پرس وہیں گھر پر بھول آئی ہے۔ چنانچہ اس نے کیمسٹ سے کہا: "میں مسز یوسف غلزئی ہوں۔ پرس ساتھ نہیں لائی ہوں۔ بل بھجوا دیجیے گا۔ یوسف صاحب ادا کر دیں گے۔"

گھر آ کے اس نے خادمہ کو ڈبیہ کی ساری گولیاں دیں اور اس سے کہا: "اچھی طرح پیس کے لاؤ . . ." یہ سفوف اس نے گرم گرم دودھ میں ڈالا اور پی گئی۔

تھوڑی دیر بعد ایک نوکر آیا اور اس نے پرویز سے کہا: "آپ کی والدہ آئی ہیں۔ یوسف صاحب آپ کو بلاتے ہیں۔"

پرویز کی آنکھیں بالکل خشک تھیں، مگر ان میں غنودگی تھی، اس لیے کہ زہر کا اثر شروع ہو گیا تھا منہ دھو کر اور بال سنوار کر وہ اندر گئی۔ اپنی ماں سے بغل گیر ہوئی اور یوسف کے ساتھ قالین پر بیٹھ گئی۔

ماں سے باتیں کرتے کرتے ایک دم پرویز کو چکر آیا اور وہ بے ہوش ہو کر ایک طرف لڑھک گئی ماں نے تشویش کا اظہار کیا، اس لیے کہ اس کی بچی کا رنگ نیلا ہو رہا تھا، مگر یوسف نے، جو نشے میں چور تھا۔ کسی قسم کے تردد کا اظہار نہ کیا اور بشریٰ سے کہا: "کچھ بھی نہیں ہوا اسے . . . بن رہی ہے۔" پھر اس نے بڑے زور سے پرویز کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑا اور حاکمانہ انداز میں کہا: "اٹھ، مجھے یہ ایکٹنگ پسند نہیں۔"

بشریٰ نے بھی اس کو آوازیں دیں۔ اس کو ہلایا جلایا۔ آخر ڈاکٹر کو بلایا گیا، مگر وہ جب آیا تو پرویز اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔

پرویز کی خودکشی کے متعلق کئی قصے مشہور ہیں، لیکن اس کا جو پہلو مجھ پر معتبر ذرائع سے منکشف ہوا، میری سمجھ میں آ گیا تھا، اس لیے میں خاموش رہا اور انتظار کرتا رہا کہ اس کی تصدیق کب ہوتی ہے۔

قمر صاحب، بشریٰ کو ہسپتال سے واپس لائے تو میں ان سے ملا ــــ ان کے پاس اب موٹر نہیں تھی۔ میں نے اس بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے شاعرانہ بے اعتنائی اختیار کرتے ہوئے جواب دیا: "جس کی تھی، لے گئی۔"

میں نے پوچھا: "کیا مطلب؟"

جواب: "مطلب یہ کہ موٹر میری کب تھی۔ وہ تو ان محترمہ کی تھی۔ میں نے کچھ عرصہ سے اس کا استعمال ترک کر دیا تھا۔ اپنی سائیکل پر دفتر جاتا اور اسی پر واپس آتا تھا۔ ہاں جب ان کو ضرورت ہوتی تو میں ڈرائیور کے فرائض ادا کرتا تھا۔"

مَیں کچھ کچھ سمجھ گیا: "کیا ناچاقی ہو گئی؟"

"ہاں کچھ ایسا ہی سمجھیے۔۔۔ مَیں نے اُن کو طلاق دے دی ہے۔"

بعد میں مجھے جب قمر صاحب سے مفصّل گفتگو کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے مجھے بتایا کہ نکاح وکاح کوئی نہیں ہوا تھا۔۔۔ طلاق نامہ انھوں نے صرف اس لیے لکھا کہ لوگوں میں اس بات کی تشہیر نہ ہو کہ وہ غیر شرعی طور پر اُن کے ساتھ قریب قریب دو برس رہی ہیں۔۔۔

مَیں زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ اُن کے درمیان جو فیصلہ کن لڑائی جھگڑا ہوا، اُس کی وجہ یہ تھی کہ بقول قمر صاحب اُن کی محترمہ نے حیدر آباد کے ایک ادھیڑ عمر کے مہاجر رئیس سے جسمانی رشتہ قائم کر لیا تھا۔ اِس لیے کہ اُن کے لیے قمر صاحب کی ذات میں وہ کشش ختم ہو گئی تھی، جو کسی زمانے میں اُن کو نظر آتی تھی، بلکہ یُوں کہیے کہ جس کو دیکھ کر اُن کی آنکھیں چُندھیا گئی تھیں۔

مجھے افسوس ہوا، اِس لیے کہ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ قمر صاحب نے اپنی بیٹیوں ہونہار بچیوں کو سکول سے اٹھا لیا ہے، اب خود "گولڈ فلیک" کے بدلے "بگلا" مارکہ سستے سگریٹ پیتے ہیں؛ پہلے تفریح کے اتنے سامان تھے۔ پر اب شتر بے مہار کی طرح بے مطلب اِدھر اُدھر چکر لگاتے رہتے ہیں۔

محترمہ بشریٰ کے متعلق انھوں نے مجھے بہت کچھ بتایا، لیکن مَیں یہ نہ سمجھ سکا کہ جب علیحدگی کا فیصلہ ہو چکا تھا اور حیدر آباد کے مہاجر رئیس صاحب نے بشریٰ کے ساتھ باقاعدہ راتیں گزارنا شروع کر رکھی تھیں تو اُن کو "سونورل" کی تیس گولیاں کھا کر خودکشی کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ بظاہر یہ خطرناک فعل قمر صاحب کے اس اعتراض کا ردِعمل معلوم ہوتا ہے، جو اُن کو بشریٰ کے چال چلن پر تھا، لیکن ایمان کی بات ہے کہ مجھے اِس کے عقب میں ایسا کوئی دِل شکن عنصر نظر نہیں آتا، جو انسان کو موت کی گود میں سو جانے پر مجبور کر دے ـــــ اِس پر قمر صاحب بھی کوئی روشنی ڈالنے سے معذور رہیں۔

ایک دِن باتوں باتوں میں اُن سے مَیں آخر پُوچھ ہی بیٹھا "سونورل؛ کھانے کی روایت جو بشریٰ کی بیٹی پروین نے قائم کی، آپ نے اور بشریٰ نے جاری رکھی۔۔۔ لیکن آپ یہ بتائیے کہ وہ کون سی وجہ تھی، جس نے اُس غریب پروین کو اتنے خطرناک اقدام کے لیے تیار کر دیا۔۔۔ آپ کئی بار مجھے بتا چکے ہیں کہ پروین اپنے شوہر یوسف غلزئی کی حسامکاریوں کی عادی ہو چکی تھی، بلکہ وہ خود اُس کی معاونت کرتی تھی۔۔ کوئی عورت جب ... کی انتہا کو پہنچ جاتی ہے، پھر اُس کو خودکشی کا خیال تک بھی نہیں آ سکتا۔۔۔ میرا اپنا خیال ہے بلکہ ... ہے کہ پروین کی ماں بشریٰ نے، جسے آپ محترمہ کہتے ہیں، یُوسف سے ایسے تعلقات پیدا کر لیے تھے جنھیں ... لوگ ناجائز کہتے ...۔۔۔"

قمر صاحب نے صرف اِن الفاظ میں میری تصدیق کی: "یہ بالکل درست ہے۔۔۔ ایک دن شراب کے نشے میں بشریٰ نے ... کا اقرار کیا تھا، اور بہت روئی تھی۔"

اُس دِن شام کو معلوم ہوا کہ حیدر آباد کے مہاجر رئیس صاحب نے "سونورل" کی چوبیس گولیاں کھالی ہیں۔ بشریٰ نے حسبِ معمول تین کھائی تھیں۔ دونوں ہسپتال میں بے ہوش پڑے تھے ــــــ دوسرے روز رئیس صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے۔ چوبیس ہی میں اُن کا کام تمام ہو گیا۔ مگر بشریٰ بچ گئی۔

آج کل وہ مرحوم کا سوگ منا رہی ہے ــــــ جس شخص کے پاس اُس نے موٹر بیچی تھی، وہ دِن رات اُس کے پاس دِل جوئی کے لیے موجود رہتا ہے۔

پھانو

تیز بخار کی حالت میں اُسے اپنی چھاتی پر کوئی ٹھنڈی چیز رینگتی محسوس ہوئی۔ اُس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ جب وہ مکمل طور پر بیدار ہوا تو اُس کا چہرہ بخار کی شدت کے باعث تمتما رہا تھا —— اُس نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ پھانو فرش پر بیٹھی، پانی میں کپڑا بھگو کر اُس کے ماتھے پر لگا رہی ہے۔

جب پھانو نے اُس کے ماتھے پر سے کپڑا اتارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اُس نے پھانو کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے سینے پر رکھ کر ہولے ہولے پیار سے اپنا ہاتھ اُس پر پھیرنا شروع کر دیا۔

اُس کی سُرخ آنکھیں دو انگارے بن کر دیر تک پھانو کو دیکھتی رہیں —— پھانو اُس دہکتی ہوئی ٹکٹکی کی تاب نہ لا سکی اور ہاتھ چھڑا کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی —— وہ اُٹھ کر بستر میں بیٹھ گیا۔

پھانو سے، جس کا اصل نام فاطمہ تھا، اُس کو غیر محسوس طور پر محبت ہو گئی تھی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ کردار و اطوار کی اچھی نہیں، محلے میں جتنے لونڈے ہیں، اُس سے عشق لڑا چکے ہیں —— لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اُس کو پھانو سے محبت ہو گئی تھی۔

وہ اگر بخار میں مبتلا نہ ہوتا تو یقیناً اُس نے اپنے اِس جذبے کا اظہار پھاتو سے کبھی نہ کیا ہوتا، مگر تیز بخار کے باعث اُس کو اپنے دل و دماغ پر کوئی احتساب نہیں رہا تھا ——— یہی وجہ ہے کہ اُس نے اونچی آواز میں پھاتو کو پکارنا شروع کیا: "اِدھر آؤ، میری طرف دیکھو۔ ۔ ۔ جانتی ہو، مَیں تمھاری محبت میں گرفتار ہوں، بہت بُری طرح تمھاری محبت میں گرفتار ہوں۔ ۔ ۔ اُسی طرح تمھاری محبت میں پھنس گیا ہوں، جیسے کوئی دلدل میں پھنس جائے۔ ۔ ۔ مَیں جانتا ہوں، تُم کیا ہو۔ مَیں جانتا ہوں، تُم اِس قابل نہیں ہو کہ تُم سے محبت کی جائے، مگر مَیں یہ سب کچھ جانتے بُوجھتے ہُوئے بھی تُم سے محبت کرتا ہوں۔ ۔ ۔ لعنت ہو مجھ پر، لیکن چھوڑو اِن باتوں کو اور میری طرف دیکھو۔ ۔ ۔ مَیں بخار کے علاوہ تمھاری محبت میں بھی پھنکا جا رہا ہُوں۔ ۔ ۔ پھاتو، پھاتو۔ ۔ ۔ مَیں، مَیں۔ ۔ ۔" اُس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور اُس پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی، اور اُس نے ڈاکٹر مکند لال بھاٹیہ سے کونین کے نقصانات پر بحث شروع کر دی۔

چند لمحات کے بعد وہ اپنی ماں سے، جو وہاں موجود نہیں تھی، مخاطب ہوا: "بی بی جی، میرے دماغ میں بے شمار خیالات آ رہے ہیں۔ ۔ ۔ آپ حیران کیوں ہوتی ہیں۔ ۔ ۔ مجھے پھاتو سے محبت ہے، اُسی پھاتو سے، جو ہمارے پڑوس میں نیچے ہندوؤں کے ہاں ملازم تھی اور جو آپ کی ملازم ہے۔ ۔ ۔ آپ نہیں جانتیں، اِس لڑکی نے مجھے کتنا ذلیل کرا دیا ہے۔ ۔ ۔ یہ محبت نہیں، خسرہ ہے۔ نہیں خسرے سے بڑھ چڑھ کر۔ ۔ ۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ ۔ ۔ مجھے تمام ذلتیں برداشت کرنی ہوں گی۔ ۔ ساری گلی کا کوڑا کرکٹ اپنے سر پر اُٹھانا ہوگا۔ ۔ ۔ یہ سب کچھ ہو کے رہے گا۔ ۔ ۔"

آہستہ آہستہ اُس کی آواز کمزور ہوتی گئی اور اُس پر غنودگی طاری ہوگئی۔ اُس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ اُس کی پلکوں پر بوجھ سا آن پڑا ہے۔

پھاتو پلنگ کے پاس فرش پر بیٹھی اُس کی بے جوڑ ہذیانی گفتگو سُنتی رہی، مگر اُس پر کچھ اثر نہ ہوا ——— وہ ایسے بیماروں کی کئی مرتبہ تیمارداری کر چکی تھی۔

بخار کی حالت میں جب اُس نے اپنی محبت کا اعتراف کیا تو پھاتو نے محسوس کیا، اُس اعتراف کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا، اِس لیے کہ اُس کا گوشت بھرا چہرہ جذبات سے بالکل عاری تھا۔ ممکن ہے، اُس کے دل کے کسی گوشے میں ہلکی سی سرسراہٹ پیدا ہوئی ہو، مگر وہ چربی کی تہوں سے نکل کر باہر نہیں آ سکی ہے۔

پھاتو نے رُومال نچوڑ کر تازہ پانی میں بھگویا اور اس کے ماتھے پر رکھنے کے لیے اُٹھی ——— اب کی بار پھاتو کو اِس لیے اُٹھنا پڑا کہ اُس نے کروٹ بدل لی تھی ——— جب پھاتو نے آہستہ سے، ذرا اُدھر سے مڑ کر اُس کے ماتھے پر گیلا رُومال جمایا تو اُس کی نیم وا آنکھیں یُوں کھُل گئیں، جیسے لال لال زخموں کے مُنہ ٹانکے اُدھڑ جانے پر کھل جاتے ہیں۔

اُس نے ایک لمحے کے لیے پھاتو کے جھُکے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا ——— پھاتو کے گال تھوڑے

سے نیچے جھک آئے تھے ـــــ ایک دم جانے اُس پر کیا وحشت سوار ہوئی کہ اُس نے پھاتو کو اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑ کر اِس زور سے اپنی چھاتی کے ساتھ بھینچا کہ پھاتو کی ریڑھ کی ہڈی کڑکڑ بول اٹھی۔ پھر اُس نے پھاتو کو اپنی رانوں پر لٹا کر اُس کے موٹے اور گدگدے ہونٹوں پر اِس زور سے اپنے تپتے ہوئے ہونٹ پیوست کیے، جیسے وہ انھیں داغنا چاہتا ہو۔

اُس کی گرفت اِس قدر زبردست تھی کہ پھاتو کوشش کے باوجود خود کو آزاد نہ کر سکی۔

اُس کے ہونٹ دیر تک پھاتو کے ہونٹوں پر استری کرتے رہے ـــــ پھر اچانک اُس نے پھاتو کو ایک جھٹکے سے الگ کر دیا، اور اُٹھ کر بستر میں یوں بیٹھ گیا، جیسے اُس نے کوئی بڑا ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔

پھاتو ایک طرف سمٹ گئی۔

وہ سہم گئی تھی ـــــ وہ محسوس کر رہی تھی، جیسے اُس کے لبوں پر ابھی تک اُس کے پپڑی جیسے ہونٹ سرک رہے ہیں۔

جب پھاتو نے کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھا تو وہ اُس پر برس پڑا: "تم یہاں کیا کر رہی ہو . . . تم بھتنی ہو . . . ڈائن ہو . . . میرا کلیجہ نکال کر چبانا چاہتی ہو . . . جاؤ، جاؤ . . ." یہ کہتے کہتے اُس نے اپنے وزنی سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا، جیسے اُس کا سر گر پڑے گا، اور ہولے ہولے بڑبڑانے لگا: "پھاتو، مجھے معاف کر دو . . . مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں . . . میں بس ایک بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے دیوانگی کی حد تک تُم سے محبت ہے، اِس لیے کہ تُم سے محبت کی جائے . . . میں تم سے محبت کرتا ہوں، اِس لیے کہ تُم نفرت کے قابل ہو . . . تم عورت نہیں ہو، ایک سالم مکان ہو . . . ایک بہت بڑی بلڈنگ ہو . . . مجھے تمھارے سب کمروں سے محبت ہے، اِس لیے کہ وہ غلیظ ہیں، شکستہ ہیں . . . کیا یہ عجیب بات نہیں . . ."

پھاتو خاموش رہی۔ اُس پر ابھی تک اُس آہنی گرفت اور اُس کے خوفناک بوسے کا اثر موجود تھا ـــــ وہ اُٹھ کر کمرے سے باہر جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اُس نے پھر ہذیانی کیفیت میں بڑبڑانا شروع کر دیا ـــ پھاتو نے اُس کی طرف دیکھا ـــــ وہ جیسے کسی غیر مرئی آدمی سے باتیں کر رہا تھا۔

بستر پر اُس نے بڑی مشکل سے کروٹ بدلی، پھاتو کو اپنی سُرخ سُرخ آنکھوں سے دیکھا اور پوچھا: "کیا کہہ رہی ہو تم؟"

پھاتو نے کچھ بھی نہیں کہا تھا، اِس لیے وہ خاموش رہی۔

پھاتو کی خاموشی سے اُسے خیال آیا کہ وہ ہذیانی کیفیت میں بے شمار باتیں کر چکا ہے ـــــ جب اُس کو اِس بات کا احساس ہوا کہ وہ اپنی محبت کا اظہار بھی اُس سے کر چکا ہے تو اسے اپنے آپ پر بے حد غصہ آیا ـــــ اِسی غصے میں وہ پھاتو سے خفا ہوا: "میں نے تم سے جو کچھ کہا تھا، وہ بالکل غلط ہے . . . مجھے تم سے نفرت ہے۔"

پھاتو نے صرف اتنا کہا: "جی ٹھیک ہو گا۔"

وہ کڑکا: "صرف ٹھیک ہی نہیں، سو فی صد حقیقت ہے۔ ۔ ۔ مجھے تم سے سخت نفرت ہے۔ ۔ جاؤ، چلی جاؤ میرے کمرے سے۔ ۔ ۔ خبردار جو کبھی اِدھر کا رُخ کیا۔"

پھاتو نے حسبِ معمول نرم لہجے میں کہا: "جی اچھا۔"

یہ کہہ کر وہ جانے لگی تو اُس نے روک لیا: "ٹھہرو۔ ۔ ۔ ایک بات سُنتی جاؤ۔"

"فرمایئے۔"

"نہیں، مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ ۔ ۔ تم جا سکتی ہو۔"

پھاتو نے کہا: "میں جا ہی تو رہی تھی۔ ۔ ۔ آپ نے خود مجھے روکا ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے برتن اٹھائے اور کمرے سے نکلنے لگی، مگر اُس نے پھر اُسے آواز دے کر روکا۔

وہ رُکی تو اُس نے کہا: "میں ایک بات تم سے کہنا بھول گیا ہوں۔"

پھاتو نے برتن تپائی پر رکھے اور اُس سے کہا: "کیا بات ہے۔ ۔ ۔ بتا دیجیے۔ ۔ ۔ مجھے اور بہت سے کام بھی کرنے ہیں۔"

وہ سوچنے لگا کہ اُس نے پھاتو کو روکا کیوں تھا۔ اُسے پھاتو سے ایسی کون سی اہم بات کرنا تھی ——— وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پھاتو نے اُس سے کہا: "میاں صاحب، میں کھڑی انتظار کر رہی ہوں۔ ۔ ۔ آپ کو مجھ سے کیا کہنا ہے؟"

وہ بوکھلا گیا: "مجھے کیا کہنا تھا۔ ۔ ۔ کچھ بھی تو نہیں کہنا تھا۔ ۔ ۔ میرا مطلب ہے، کہنا تو کچھ تھا، مگر میں بھول گیا ہوں۔"

"اچھا اب یاد کر لیجیے۔ ۔ ۔ میں یہاں کھڑی ہوں۔"

اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور یاد کرنے لگا کہ اُسے پھاتو سے کیا کہنا تھا ——— اُس کے دماغ میں بے شمار خیالات تھے۔ وہ دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ پھاتو اُس کے گھر سے چلی جائے، اِس لیے کہ وہ اُس سے اِس قدر نفرت کرتا ہے کہ اب وہ نفرت بے پناہ محبت میں تبدیل ہو گئی ہے۔

اُس نے تھوڑے عرصے کے بعد آنکھیں کھولیں ——— پھاتو تپائی کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

اُس نے سمجھا کہ شاید یہ سب خواب ہے، پھر جب اُس نے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا تو اُسے معلوم ہوا کہ یہ خواب نہیں، حقیقت ہے ——— لیکن اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ پھاتو کیوں بُت کی مانند تپائی کے ساتھ لگی کھڑی ہے۔

اُس نے کہا: "تو یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے؟"

پھاتو نے جواب دیا: "آپ ہی نے تو کہا تھا کہ آپ کو مجھ سے کوئی ضروری بات کہنی ہے۔"

وہ چڑ گیا ——— جھنجھلا کر بولا: "تم سے مجھے کون سی ضروری بات کہنا تھی۔ ۔ ۔ جاؤ۔ ۔ ۔ دُور ہٹ

جاؤ میری نظروں سے "
بچاتو نے تشویشناک نظروں سے اس کی طرف دیکھا "ایسا لگتا ہے، آپ کا بخار تیز ہو گیا ہے۔ ۔ میں بی بی جی کہتی ہوں کہ ڈاکٹر کو بلا لیں "
وہ اور زیادہ چڑ گیا " ڈاکٹر آیا تو میں اُسے گولی مار دوں گا۔ ۔ اور تمہارا تو میں ان ہاتھوں گلا گھونٹ دوں گا "
بچاتو نے اپنے لہجے کو اور زیادہ نرم بنا کر کہا " آپ ابھی گھونٹ ڈالیے۔ ۔ میں اپنی زندگی سے اکتا چکی ہوں "
اُس نے پوچھا "کیوں ؟"
"بس اب جی نہیں چاہتا زندہ رہنے کو۔ ۔ میاں صاحب، آپ کو معلوم نہیں، میں یہ دن کیسے گزار رہی ہوں۔ ۔ ۔ اللہ قسم، ایک ایک پل زہر کا گھونٹ ہے۔ ۔ خدا کے لیے آپ میرا گلا گھونٹ کر مجھے مار دیجیے۔ ۔ ۔"
وہ لحاف کے اندر کانپنے لگا " بچاتو، جاؤ۔ ۔ ۔ مجھے تم سے نفرت ہے "
بچاتو نے بڑی معصومیت سے کہا " میں جانے لگتی ہوں، پر آپ مجھے روک لیتے ہیں "
اُس نے جھنجھلا کر کہا " کون حرامزادہ تجھے روکتا ہے۔ ۔ جاؤ دُور ہو جاؤ "
بچاتو جانے لگی تو اُس نے اُسے پھر روک لیا " ٹھہرو "
وہ ٹھہر گئی " فرمائیے "
"تم نہایت واہیات عورت ہو۔ ۔ خدا تمہیں غارت کرے۔ ۔ ۔ جاؤ اب میری نظروں سے غائب ہو جاؤ "
بچاتو برتن اٹھا کر چلی گئی۔

ایک مہینے کے بعد محلے میں شور مچا کہ بچاتو کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔
سب اُس کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے ــــــ عورتیں خاص طور پر اُس کے کردار میں کیڑے ڈال رہی تھیں۔

اور بچاتو اپنے میاں صاحب کے ساتھ کلکتے میں ازدواجی زندگی بسر کر رہی تھی۔
اس کا شوہر ہر روز اُس سے کہتا " فاطمہ، مجھے تم سے نفرت ہے "
وہ مسکرا کر جواب دیتی " یہ نفرت اگر نہ ہوتی تو میری زندگی کیسے سنورتی۔ ۔ ۔ آپ مجھ سے ساری عمر نفرت ہی کرتے رہیے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

○○

بیمار

عجیب بات ہے کہ جب بھی کسی لڑکی یا عورت نے مجھے خط لکھا، "بھائی" سے مخاطب کیا، اور بے ربط تحریر میں اس بات کا ضرور ذکر کیا کہ وہ شدید طور پر علیل ہے، میری تصانیف کی تعریفیں کیں، زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ لڑکیاں اور عورتیں، جو مجھے خط لکھتی ہیں، بیمار کیوں ہوتی ہیں ——— شاید اس لیے کہ میں خود اکثر بیمار رہتا ہوں۔ یا کوئی اور وجہ ہوگی، اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ میری ہمدردی چاہتی ہیں۔

میں ایسی لڑکیوں اور عورتوں کے خطوں کا عموماً جواب نہیں دیا کرتا، لیکن بعض اوقات دے بھی دیا کرتا ہوں ——— آخر انسان ہوں۔ خط اگر بہت ہی دردناک ہو تو اس کا جواب دینا انسانی فرائض میں شامل ہو جاتا ہے۔

پچھلے دنوں مجھے ایک خط موصول ہوا، جو کافی لمبا تھا ——— اس میں بھی ایک خاتون نے، جس کا

نام میں ظاہر کرنا نہیں چاہتا، یہ لکھا تھا کہ وہ میری تحریروں کی شیدائی ہے، وہ ایک عرصے سے بیمار ہے، اس کا خاوند بھی دائم المریض ہے ـــــ اور اُس نے اپنا خیال ظاہر کیا تھا کہ جو بیماری اُسے لگی ہے، اُس کے خاوند کی وجہ سے ہے۔

میں نے اِس خط کا جواب نہ دیا ـــــ لیکن اُس کی طرف سے دوسرا خط آیا، جس میں گلہ تھا کہ میں نے اُس کے پہلے خط کی رسید تک نہیں بھیجی ہے ـــــ چنانچہ مجھے مجبوراً اُس کو خط لکھنا پڑا، مگر بڑی احتیاط کے ساتھ۔

میں نے اپنے خط میں اُس سے ہمدردی کا اظہار کیا ـــــ اُس نے لکھا تھا کہ وہ اور بھی زیادہ علیل ہو گئی ہے اور مرنے کے قریب ہے ـــــ یہ پڑھ کر میں بہت متاثر ہوا تھا۔ چنانچہ اُسی تاثر کے ماتحت میں نے بڑے جذباتی انداز میں اُسے خط لکھا اور اُس کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ زندگی، زندہ رہنے کے لیے ہے؛ زندگی سے مایوس ہو جانا موت ہے؛ اگر وہ خود میں اتنی قوتِ ارادی پیدا کرے تو اُس کی بیماری کا نام و نشان تک نہ رہے گا ـــــ اور کہ میں خود پچھلے دنوں موت کے منہ میں تھا، سب ڈاکٹر جواب دے چکے تھے، لیکن میں نے موت کا خیال بھی نہ کیا تھا، نتیجہ اس کا یہ نکلا تھا کہ ڈاکٹر حیرت میں گم ہو کے رہ گئے تھے اور میں ہسپتال سے باہر نکل آیا تھا۔

میں نے اُس کو یہ بھی لکھا کہ قوتِ ارادی ہی ایک ایسی چیز ہے، جو ہر ناممکن چیز کو ممکن بنا دیتی ہے، وہ اگر بیمار ہے تو خود کو یہ یقین دلائے کہ نہیں، وہ بیمار نہیں، اچھی بھلی تندرست ہے۔

میرے خط کے جواب میں اُس نے جو کچھ لکھا، اُس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اُس پر میرے وعظ کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔

اُس کا خط بڑا طویل تھا، پانچ صفحوں پر مشتمل ـــــ اُس کی منطق اور اُس کا فلسفہ عجیب قسم کا تھا۔ وہ مُصِر تھی کہ خدا کو یہ منظور نہیں کہ وہ زیادہ دیر تک اِس دُنیا میں زندہ رہے ـــــ اِس کے علاوہ اُس نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں اپنی تازہ کتابیں اُسے بھیج دوں۔

میں نے دو نئی کتابیں اُس کو بھیج دیں۔

اُن کی رسید آ گئی ـــــ بہت بہت شکریہ ادا کیا تھا، اور میری تعریفیں ہی تعریفیں تھیں۔

مجھے بڑی کوفت ہوئی ـــــ جو کتابیں میں نے اُس کو بھیجی تھیں، میری نظر میں اُن کی وقعت نہیں تھی، اِس لیے کہ وہ صرف ہر روز کمانے کے لیے لکھی گئی تھیں ـــــ چنانچہ میں نے اُسے لکھا: "تم نے میری اِن کتابوں کی جو اتنی تعریف کی ہے، غلط ہے۔ یہ کتابیں محض بکواس ہیں ۔۔۔ تم میری پُرانی کتابیں پڑھو۔ اُن میں تم پُوری طرح مجھے جلوہ گر پاؤ گی۔"

میں نے اِس خط میں افسانہ نویسی کے فن پر بھی بہت کچھ لکھ دیا ـــــ بعد میں مجھے افسوس ہوا کہ میں نے یہ جھک کیوں ماری۔ اگر لکھنا ہی تھا تو کسی رسالے یا پرچے کے لیے لکھتا، یہ کیا کہ ایک عورت کو جس کا میں

صورت آشنا بھی نہیں، اتنا طویل اور پُرمغز خط لکھ دیا۔
بہرحال جب لکھ دیا تھا تو اُسے پوسٹ کرنا ہی تھا۔
اُس کا جواب تیسرے روز آگیا ــــــ اب کے مجھے "پیارے بھائی جان" سے مخاطب کیا گیا تھا ــــــ اُس نے میری پُرانی تصنیفات منگوائی تھیں اور انھیں پڑھ رہی تھی، لیکن اُس کی بیماری روز بروز بڑھ رہی تھی ــــــ اُس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ وہ کسی حکیم کا علاج کیوں نہ کرائے، کیونکہ وہ ڈاکٹروں سے بالکل نا امید ہو چکی ہے۔

مَیں نے اُسے جواب میں لکھا: علاج تم کسی سے بھی کراؤ۔ خواہ وہ ڈاکٹر ہو یا حکیم، لیکن یاد رکھو، سب سے اچھا معالج خود آدمی آپ ہوتا ہے۔۔ اگر تم اپنی ذہنی پریشانیاں دُور کر دو تو چند روز میں تندرست ہو جاؤ گی۔"

مَیں نے اِس موضوع پر ایک طویل لیکچر بھی اُس کو لکھ کر بھیجا ــــــ ایک مہینے کے بعد اُس کی رسید پہنچی، جس میں یہ لکھا تھا کہ اُس نے میری نصیحت پر عمل کیا، لیکن خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا، اور یہ کہ وہ مجھ سے ملنے آ رہی ہے ــــــ وہ دو تین روز میں حیدر آباد سے بمبئی پہنچ جائے گی اور چند روز میرے ہاں ٹھہرے گی۔

مَیں بہت پریشان ہوا ــــــ چھوٹا چھوٹا سا تانک تھا۔ ایک فلیٹ میں رہتا تھا جس میں دو کمرے تھے ــــــ مَیں نے سوچا، اگر یہ محترمہ آ گئیں تو مَیں ایک کمرہ اُن کو دے دوں گا، اُس میں وہ چند دن گزارنا چاہیں تو گزار لیں، علاج کا بندوبست بھی ہو جائے گا، اِس لیے کہ بمبئی کا ایک بہت بڑا حکیم میرا بڑا مہربان تھا۔
چھ روز تک، آپ یہ سمجھیے کہ مَیں سُولی پر لٹکا رہا ــــــ اخبار والے نے دروازے پر دستک دی تو مَیں نے یہ سمجھا کہ وہ محترمہ تشریف لے آئی ہیں۔ باورچی خانے میں نوکر نے اگر کسی برتن پر راکھ ملنا شروع کی تو میرا دل دھک دھک کرنے لگا کہ شاید وہ آواز محترمہ کے سینڈلوں کی ہے۔
ساتویں روز صبح مَیں نے اطمینان سے "ٹائمز آف انڈیا" پڑھا، اِس لیے کہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اب نہیں آئے گی۔

مَیں ہندو مُسلم فسادات کی خبریں پڑھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی ــــــ مَیں سمجھا کہ دودھ والا ہے۔ چنانچہ مَیں نے نوکر کو آواز دی: "رحیم دیکھو کون ہے؟"
رحیم چائے بنا رہا تھا ــــــ وہ اُبلتی ہوئی کیتلی کو وہیں چولہے پر چھوڑ کر باہر نکلا اور اُس نے دروازہ کھولا ــــــ تھوڑی دیر کے بعد وہ میرے کمرے میں آیا اور اُس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: "ایک عورت آئی ہے۔"

مَیں حیرت زدہ ہو گیا: "عورت؟"

"جی ہاں . . . ایک عورت باہر کھڑی ہے . . . وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ عورت وہی ہوگی ——— بیمار، جو مجھے خط لکھتی رہتی ہے ——— چنانچہ میں نے رحیم سے کہا: "اس کو اندر لے آؤ اور بیٹھے کمرے میں بٹھا دو، اور کہہ دو کہ صاحب ابھی آتے ہیں۔"

"جی اچھا" کہہ کر رحیم چلا گیا۔

میں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ وہ عورت کس قسم کی ہوگی ——— دق کی ماری ہوئی یا مفلوج ——— میرے پاس کیوں آئی ہے ——— نہیں مجھ سے ملنے نہیں آئی ہے ——— غالباً کسی طبیب سے اپنا علاج کرانے آئی ہے۔

میں اٹھا اور غسل خانے میں چلا گیا ——— وہاں دیر تک نہاتا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ عورت، جو اس کو اتنے لمبے چوڑے خط لکھتی رہی ہے اور جس کو کوئی خطرناک بیماری چمٹی ہوئی ہے، کس شکل صورت کی ہوگی۔

بے شمار شکلیں میرے تصور میں آئیں۔ پہلے میں نے سوچا، اپاہج ہوگی اور مجھے اس کو کچھ دینا پڑے گا۔ یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ جس دن وہ آئی، اس دن تین تاریخ تھی، اور اِدھر اُدھر کا بل ادا کرنے کے بعد تنخواہ کے تین سو روپے میرے پاس بچ گئے تھے۔ اس لیے میری پریشانی میں اضافہ نہ ہوا ——— میں نے نہاتے نہاتے یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر اسے مدد کی ضرورت ہوگی تو میں اسے ایک سو روپے دے دوں گا۔

فوراً مجھے خیال آیا کہ شاید اس کو دق ہو اور مجھے اس کو ہسپتال میں داخل کرانا پڑے ——— داخلہ کوئی مشکل نہیں تھا، اس لیے کہ میرے کئی ڈاکٹر دوست جے جے ہسپتال میں کام کرتے تھے، میں ان میں سے کسی ایک سے بھی کہہ دیتا کہ اس معذور عورت کو داخل کر لیں تو وہ کبھی انکار نہ کرتے۔

میں کافی دیر تک نہاتا اور اس عورت کے متعلق سوچتا رہا۔

عورتوں سے ملتے ہوئے مجھے بڑی الجھن محسوس ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ایک جگہ نکاح تو کر لیا تھا، لیکن پچھلے ڈیڑھ برس سے سوچ رہا تھا کہ اگر اسے اپنے گھر لے آؤں گا تو کیا ہوگا؟ جو ہونا ہوتا، وہ تو خیر ہو ہی جاتا، مگر سب سے بڑا مسئلہ، جو مجھے پریشان کیے ہوئے تھا، یہ تھا کہ میں، جس نے ساری زندگی میں کسی عورت کی قربت حاصل نہیں کی، اپنی بیوی سے کس طرح پیش آتا۔

اب ایک عورت ساتھ والے کمرے میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی اور میں ڈونگے پہ ڈونگے بھر کر اپنے بدن پر بیکار ڈال رہا تھا ——— میں اصل میں خود کو اس عورت سے ملاقات کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔

کافی دیر نہانے کے بعد میں غسل خانے سے باہر نکلا۔ کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کیے، بالوں میں تیل لگایا، کنگھی کی اور پھر سوچتے سوچتے پلنگ پر لیٹ گیا۔

چند لمحات کے بعد رحیم آیا اور اُس نے مجھ سے کہا: "وہ عورت پُوچھتی ہے کہ آپ کب فارغ ہوں گے؟"
مَیں نے رحیم سے کہا: "اُن سے کہہ دو، بس پانچ منٹ میں آتے ہیں، کپڑے تبدیل کر رہے ہیں۔"
رحیم "جی اچھا" کہہ کر چلا گیا۔

مَیں نے سوچا، اب اور زیادہ سوچنا فضُول ہے، چلو اب اُس سے مل ہی لو، اتنی خط و کتابت ہوتی رہی ہے، اور پھر وہ اتنی دُور سے ملنے آئی ہے، بیمار ہے، انسانی شرافت کا تقاضا ہے کہ اُس کی خاطر داری اور دِل جُوئی کی جائے۔

مَیں نے پلنگ پر سے اُٹھ کر سلیپر پہنے اور دوسرے کمرے میں، جہاں وہ عورت تھی، داخل ہوا ——— وہ بُرقع پہنے ہوئے تھی ——— مَیں سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔

مجھے اُس کے بُرقعے کے سیاہ نقاب میں صرف اُس کی ناک دکھائی دی، جو کافی تیکھی تھی ——— مَیں بہت اُلجھن محسوس کر رہا تھا کہ اُس سے کیا کہوں ——— بہرحال مَیں نے گفتگو کا آغاز کیا: "مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کو اتنی دیر انتظار کرنا پڑا ۔ ۔ ۔ دراصل مَیں اپنی عادت کی وجہ سے ۔ ۔ ۔"

اُس عورت نے میری بات کاٹ کر کہا: "جی کوئی بات نہیں ۔ ۔ ۔ آپ خواہ مخواہ تکلف کر رہے ہیں ۔ ۔ ۔ مَیں تو انتظار کی عادی ہو چکی ہوں۔"

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ مَیں کیا کہوں ——— بس جو لفظ زبان پر آئے، مَیں نے اگل دیے: "آپ کس کا انتظار کرتی رہی ہیں؟"

اُس نے اپنے چہرے سے نقاب تھوڑی سی اٹھائی، اِس لیے کہ وہ اپنے ننھے سے رومال سے اپنے آنسُو پُونچھنا چاہتی تھی ——— آنسُو پونچھنے کے بعد اُس نے مجھ سے پُوچھا: "آپ نے کیا کہا تھا مجھ سے؟"
اُس کی ٹھوڑی بڑی پیاری تھی، جیسے بنارسی آم کی کیری ——— جب اُس کی نقاب اُٹھی تو مَیں نے اُس کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔

مَیں اُس کے سوال کا جواب نہ دے سکا، اِس لیے کہ مَیں اُس کی ٹھوڑی میں گُم ہو گیا تھا ——— آخر اُسے ہی بولنا پڑا: "آپ نے پُوچھا تھا، مَیں کس کا انتظار کرتی رہی ہوں ۔ ۔ ۔ جواب سُننا چاہتے ہیں آپ؟"
"جی ہاں ۔ ۔ ۔ فرمائیے ۔ ۔ ۔ لیکن دیکھیے ۔ ۔ ۔ کوئی ایسی بات نہ ہو، جس سے قنوطیت کا اظہار ہو۔"

اُس عورت نے اپنی نقاب اُلٹ دی ——— مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کالی بدلیوں میں چاند نکل آیا ہے۔
اُس عورت نے نیچی نگاہوں سے مجھ سے کہا: "جانتے ہیں آپ، مَیں کون ہوں؟"
مَیں نے جواب دیا: "جی نہیں۔"

اُس نے کہا: "مَیں آپ کی بیوی ہوں، جس سے آپ نے آج سے ڈیڑھ برس پہلے نکاح کیا تھا ۔ ۔ ۔ مَیں آپ کو لکھتی رہی ہوں کہ مَیں بیمار ہوں ۔ ۔ ۔ مَیں بیمار نہیں ہوں ۔ ۔ ۔ لیکن اگر آپ نے اِس طرح مجھے

انتظار میں رکھا تو میں یقیناً بیمار ہو جاؤں گی، اور مر بھی جاؤں گی۔۔"

میں دوسرے روز ہی اُس کو گھر لے آیا، بڑے ٹھاٹ سے —— اب میں بہت خوش ہوں۔

یہ واقعہ مجھے میرے ایک دوست نے، جو افسانہ نگار اور شاعر ہے، سُنایا تھا، جسے میں نے اپنے انداز میں رقم کیا ہے۔

○○

گلگت خان

شہباز خان نے ایک دن اپنے ملازم جہانگیر کو، جو اُس کے ہوٹل میں اندر باہر کا کام کرتا تھا، اُس کی سُست رفتاری سے تنگ آکر برطرف کر دیا ـــــ اصل میں جہانگیر سُست رو نہیں تھا۔ وہ اِس قدر تیز تھا کہ اُس کی ہر حرکت شہباز خان کو غیر متحرک معلوم ہوتی تھی۔

شہباز خان نے اُس کو ایک مہینے کی تنخواہ دی ـــــ جہانگیر نے اُس کو سلام کیا اور ٹکٹ کٹا کر سیدھا بلوچستان چلا گیا، جہاں کوئلے کی کانیں نکل رہی تھیں، اور جہاں اُس کے کئی اور دوست چلے گئے تھے ـــــ اُس نے گلگت اپنے بھائی حمزہ خان کو خط لکھا کہ وہ شہباز خان کے یہاں ملازمت کرے، کیونکہ اُسے اپنا یہ آقا پسند تھا۔

ایک دن حمزہ خان، شہباز خان کے ہوٹل میں آیا اور ایک کارڈ دکھا کر بولا "خو اَم ملازمت چاہتا ہے... اَمارے بھائی نے لکھا ہے کہ تُم اچھا اور ٹھیک آدمی ہے... خو اَم بھی اچھا اور ٹھیک ہے... تُم کتنا پیسہ دے گا؟"

شہباز خان نے حمزہ خان کی طرف دیکھا ——— جہانگیر کا بھائی تو وہ کسی لحاظ سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ناٹا سا قد، ناک چوڑی چپٹی، نہایت بدشکل۔

شہباز خان نے اُسے ایک نظر دیکھ کر اور جہانگیر کا خط پڑھ کر سوچا کہ اُس کو نکال باہر کرے، مگر وہ نیک آدمی تھا اور اُس نے کبھی کسی سائل کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیا تھا۔

حمزہ خان کو چنانچہ اُس نے پندرہ روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا اور یہ ہدایت کر دی کہ جو کام اُس کے سپرد کیا جائے، ایمان داری سے کرے۔

حمزہ خان نے اپنے بدنما ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے شہباز خان کو یقین دلایا: "خان بادشاہ، اُم تم کو کبھی تنگ نہیں کرے گا۔ ۔ ۔ جو تم کہے گا، مانے گا۔"

شہباز خان یہ سُن کر خوش ہو گیا۔

حمزہ خان نے شروع شروع میں کچھ اتنا اچھا کام نہ کیا، لیکن تھوڑے عرصے میں وہ سب کچھ سیکھ گیا ——— چائے کیسے بنائی جاتی ہے، شکر کے ساتھ گڑ کتنا ڈالا جاتا ہے، کوئلے والیوں سے کوئلے کیسے حاصل کیے جاتے ہیں، اور گاہکوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھنا چاہیے، یہ سب اُس نے سیکھ لیا۔

اُس میں صرف ایک کمی تھی کہ وہ بے حد بدشکل تھا۔ بدتمیز بھی کسی حد تک تھا ——— اُس کی شکل صورت دیکھ کر شہباز خان کے ہوٹل میں آنے جانے والے کچھ گھبرا سے جاتے ——— مگر جب گاہک آہستہ آہستہ اُس کی بدصورتی سے مانوس ہو گئے تو انھوں نے اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا، بلکہ بعض لوگ تو اُس سے دلچسپی لینے لگے، اس لیے کہ وہ کافی دلچسپ چیز بھی تھا ——— اس دلچسپی سے حمزہ خان کو تسکین نہیں ہوتی تھی۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ محض ہنسی مذاق کی خاطر یہ لوگ، جو ہوٹل میں چند گھنٹے گزارنے آتے ہیں، اُس سے دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔

تھوڑے ہی دنوں میں حمزہ خان، گلگت خان کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس لیے کہ وہ کافی دیر گلگت میں رہا تھا اور وہاں کا ذکر بار بار کرتا تھا ——— بس تو ہوٹل میں آنے جانے والوں نے اُس کا نام گلگت خان رکھ دیا، جس پر حمزہ خان کو اعتراض نہیں تھا ——— "حمزہ" کے کیا معنی ہوتے ہیں، اُس کو معلوم نہیں تھا۔ لیکن گلگت کا مطلب وہ بخوبی سمجھتا تھا۔

شہباز خان کے ہوٹل میں آئے اُس کو قریب قریب ایک برس ہو گیا ——— اس پورے عرصے میں وہ محسوس کرتا رہا کہ اُس کا مالک شہباز خان

ایک دن اُس نے ہوٹل کے باہر کتے کا پلا دیکھا، جو اُس سے بھی کہیں زیادہ بدصورت تھا۔ اُس کو اُٹھا کر وہ اپنی کوٹھڑی میں لے آیا، جو اُسے ہوٹل کی بالائی منزل پر رہنے سہنے کے لیے دی گئی تھی۔ یہ اتنی چھوٹی تھی کہ اگر کتے کا ایک پلا آ جاتا تو وہ اُس کوٹھڑی میں گلگت خان کے ساتھ سما نہ سکتا۔

کتے کے اُس پلّے کی ٹانگیں ٹیڑھی میڑھی تھیں، بھوتھنی بڑی واہیات تھی ـــــ عجیب بات ہے کہ گلگت خان کی اپنی ٹانگیں، بلکہ یُوں کہیے کہ اُس کا نچلا دھڑ اُس کے اُوپر کے جسمانی حصّے کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا بالکل اُس کے مانند وہ پلّا بھی مسخ شدہ صُورت کا تھا۔

گلگت خان اُس سے بہت پیار کرتا ـــــ شہباز خان نے اُس سے کئی مرتبہ کہا کہ وہ اُس کُتّے کے بچّے کو گولی مار دے گا، مگر گلگت خان اُس کو کسی حالت میں بھی اپنے سے جُدا کرنے پر رضامند نہیں تھا۔ اُس نے شروع شروع میں تو اپنے آقا سے کچھ نہ کہا، اور خاموشی سے اُس کی باتیں سُنتا رہا، لیکن ایک روز اُس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا، "تُم ہوٹل کے مالک ہو۔ ۔ ۔ میرے دوست ٹُن ٹُن کے مالک نہیں ہو"

شہباز خان یہ سُن کر چُپ ہوگیا، اِس لیے کہ گلگت خان بڑا محنتی تھا۔ صبح پانچ بجے اُٹھتا، دو انگیٹھیاں سُلگاتا، سامنے والے نل سے پانی بھرتا اور پھر گاہکوں کی خدمت میں مصرُوف ہوجاتا۔

ٹُن ٹُن تین مہینوں کے بعد بڑا ہو گیا۔ وہ گلگت خان کے ساتھ اُسی کوٹھڑی میں سوتا تھا جو ہوٹل کی بالائی منزل پر تھی۔ سردیاں تھیں اس لیے گلگت خان کو اپنے بستر میں اُس کی موجودگی بُری معلوم نہیں ہوتی تھی، بلکہ وہ خوش تھا وہ اُس سے اِس قدر پیار کرتا ہے کہ رات کو بھی اُس کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔

"ٹُن ٹُن" نام گلگت خان کے ایک خاص گاہک نے رکھا تھا، جو اُس کی انتہائی بدصورتی کے باوجود اُس میں دلچسپی لیتا تھا ـــــ کُتّے کا وہ پلّا، جسے وہ سڑک پر سے اُٹھا کر اپنے پاس لے آیا تھا اور جس کی گردن میں اُس نے اپنی تنخواہ میں سے پیسے بچا کر ایک ایسا پٹّا خرید کر ڈال دیا تھا جس میں گھنگرو بندھے ہوئے تھے، تو اُس خاص گاہک نے، جو غالباً کسی روزنامے کا کام نویس تھا، اُن گھنگروؤں کی آواز سُن کر اُس کا نام "ٹُن ٹُن" رکھ دیا۔

ٹُن ٹُن جب بڑا ہوا تو اُس کی ٹانگیں اور بھی زیادہ چھوٹی ہوگئیں ـــــ گلگت خان کی بھی یہی حالت تھی۔ اُس کی ٹانگیں بھی دن بدن مختصر ہورہی تھیں۔ اُوپر کا دھڑ مناسب و موزوں انداز میں بڑھ گیا تھا ـــــ شہباز خان کو گلگت خان کا یہ حلیہ پسند نہیں تھا، مگر وہ محنتی تھا، گدھے کے مانند کام کرتا۔ صبح پانچ بجے سے لے کر رات کے گیارہ بارہ بجے تک ہوٹل میں رہتا۔ ایک گھڑی کے لیے بھی آرام نہ کرتا، لیکن اِس دوران میں وہ تین چار مرتبہ اُوپر اپنی کوٹھڑی میں ضرور جاتا اور اپنے پیارے کُتّے کی، جو اب بڑا ہوگیا تھا، دیکھ بھال کرتا، اُس کو ہوٹل کا بچا کھچا کھانا دیتا، پانی پلاتا اور پیار کرکے فوراً واپس چلا آتا۔

ایک دِن اُس کا ٹُن ٹُن بیمار ہوگیا۔

ہوٹل میں اکثر میڈیکل اسٹوڈنٹ آیا کرتے تھے، کیونکہ اُن کا کالج نزدیک ہی تھا ـــــ گلگت خان نے اُن میں سے ایک کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ اگر پیٹ کی شکایت ہو تو مریض کو بٹیر یا مُرغ کا گوشت کھلانا چاہیے، فاقہ دینا سخت حماقت ہے۔

اُس نے اپنے ٹُن ٹُن کو صبح سے کوئی چیز کھانے کو نہیں دی تھی، اِس لیے کہ اُس کو بدہضمی کی شکایت تھی

——— مگر جب اُس نے اُس میڈیکل اسٹوڈنٹ کی بات سُنی تو اُس نے اِدھر اُدھر کوئی مرغ تلاش کرنا شروع کیا، مگر مُرغ نہ ملا ——— محلہ ہی کچھ ایسا تھا، جس میں کوئی مرغ مرغیاں نہیں پالتا تھا۔

شہباز خان کو بٹیر بازی کا شوق تھا۔ اُس کے پاس ایک بٹیر تھی، جسے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا ——— گلگت خان نے تنکوں کا بنا ہوا پنجرہ کھولا اور ہاتھ ڈال کر بٹیر پکڑ لی ، پھر کلمہ پڑھ کے اُس کو ذبح کیا اور ٹن ٹن کو کھلا دیا۔

شہباز خان نے جب پنجرہ خالی دیکھا تو بہت پریشان ہوا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ بٹیر اُس میں سے کیسے اُڑ گئی۔ وہ تو اُس کے اشاروں پر چلتی تھی۔ کئی پالیاں اُس نے بڑی شان سے جیتی تھیں ——— اُس نے گلگت خان سے پوچھا تو اُس نے کہا: "خو مجھے کیا معلوم، تمھارا بٹیر کدھر گیا . . . بھاگ گیا ہوگا کدھر۔"

شہباز خان نے جب زیادہ جستجو کی تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے ہوٹل کے سامنے، جہاں بدر وتھی، تھوڑا سا خون اور نُچے ہوئے پَر پڑے ہیں۔ یہ بلا شبہ اُس کی بٹیر کے تھے ——— وہ سر پیٹ کے رہ گیا۔ اُس نے سوچا کوئی ظالم اُسے بھُون کر کھا گیا ہے۔

بٹیر کے پَر اُس کے جانے پہچانے تھے۔ اُس نے اُن کو پیار سے اکٹھا کیا اور اپنے ہوٹل کے پچھواڑے میں، جہاں کھُلا میدان تھا، ایک چھوٹا گڑھا کھود کر انھیں دفن کر دیا، فاتحہ پڑھی، اس کے بعد اُس نے کئی غریبوں کو اپنے ہوٹل سے مُفت کھانا بھی کھلایا، تاکہ مرحوم کی رُوح کو ثواب پہنچے۔

جب شہباز خان سے کوئی اُس کی بٹیر کے متعلق پوچھتا تو وہ کہتا: "شہید ہو گیا۔"

گلگت خان یہ سُنتا اور اپنے کان بھینچے خاموش کام میں مشغول رہتا۔

ٹن ٹن کا ٹن ٹن اچھا ہو گیا۔ اُس کو جو شکایت تھی، رفع ہو گئی۔

گلگت خان بہت خوش تھا۔ اُس نے اپنے پیارے کُتّے کی صحت یابی پر دو بھکاریوں کو ہوٹل سے کھانا کھلایا ——— شہباز خان نے جب پوچھا کہ اُس نے اُن سے دام وصول کیوں نہیں کیے تو اُس نے کہا: "کبھی کبھی خیرات بھی دے دینا چاہیے خان۔" یہ سُن کر شہباز خان چُپ ہو گیا۔

ایک دن مینا کا ایک بچّہ کہیں سے اُڑتا اُڑتا گلگت خان کے پاس آ گرا، جب کہ وہ کالج کے کسی لڑکے کے لیے ناشتہ تیار کر کے لے جا رہا تھا۔ اُس نے ناشتے کی ٹرے کو ایک طرف رکھا اور مینا کے بچّے کو، جو بے حد سہما ہوا تھا، پکڑ کر اُس پنجرے میں ڈال دیا جس میں اُس کے مالک شہباز خان کی بٹیر ہوتی تھی۔

مینا کو اُس نے سوا مہینے تک پالا پوسا۔ پھر وہ خاصی موٹی ہو گئی۔ خوب چہکتی تھی۔

ایک دن اُس کا ٹن ٹن آ گیا۔ اُس نے مینا کو دیکھا تو بے تاب ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ چاہتا ہے، کسی طرح مینا تک رسائی ہو جائے اور وہ اُسے چبا ڈالے۔

گلگت خان نے جب دیکھا کہ پنجرہ اُوپر کھونٹی کے ساتھ لٹکا ہے، جہاں اُس کا ٹن ٹن نہیں پہنچ سکتا۔ اور

بڑی حسرت بھری نظروں سے مینا کو دیکھ رہا ہے تو اُس نے پنجرہ میں سے مینا کو نکالا، اُس کے پَر نوچے، گردن مروڑی اور اپنے عزیز کتّے کے سپرد کر دی۔

ٹن ٹن نے اُس بے بال و پر پرندے کی لاش کو دو تین مرتبہ سونگھا۔ بڑے زور کی ایک چھینک اُس کے نتھنوں سے باہر نکلی اور وہ وہاں سے دوڑ گیا۔

گلگت خان کو بڑا صدمہ ہوا۔

اُسی دن کالج کی وہ دو لڑکیاں، جو باقاعدہ چائے پینے کے لیے آتی تھیں اور جن کا وہ خاص طور پر خیال رکھتا تھا، آئیں ــــــ پہلے وہ اُس سے ہنس ہنس کے باتیں کیا کرتی تھیں، مگر اب اُنھیں جانے کیا ہو گیا تھا کہ وہ اُس سے خفا خفا نظر آتی تھیں۔

ایک نے، جو گلگت خان کو بہت پسند تھی، اُس سے پوچھا: "تم نے مینا کیوں ماری؟"

گلگت خان ایک لحظے کے لیے بوکھلا سا گیا، لیکن سنبھل کر اُس نے جواب دیا: "خو بی بی جی، اَم نے اپنے کُتّے کو ڈالا تھا۔"

اُس نے پوچھا: "کیا اُس نے کھائی؟"

"خو حرام تخم نے اُس کو سونگھا اور چھوڑ دیا۔"

لڑکی نے کہا: "تو اُس کو مارنے سے کیا فائدہ ہوا۔۔۔ تم نے پہلے بھی اُس کو خان صاحب کی بٹیر ذبح کر کے دی تھی۔۔۔ کیا اُس نے کھائی تھی؟"

گلگت خان نے بڑے فخر سے جواب دیا: "کھائی تھی۔۔۔ اُس کی ہڈیاں بھی۔"

شہباز خان پاس کھڑا تھا ــــــ اُس نے جب یہ سُنا تو بڑے زور کی ایک دھول گلگت خان کی گردن پر جمائی: "تُم خراب، تُم نے اب مانا ہے۔۔۔ پہلے کیوں انکار کیا تھا؟"

گلگت خان خاموش رہا۔

دونوں لڑکیوں نے قہقہے لگائے۔

گلگت خان کو دھول کا اتنا خیال نہیں تھا، لیکن لڑکیوں کے اُن قہقہوں نے اُس کے دل کو زخمی کر دیا۔

شہباز خان کو بہت غصّہ تھا ــــــ گلگت خان کے دھول جما کر وہ اُس پر برس پڑا۔ جتنی گالیاں اسے یاد تھیں، اُس نے اپنے نوکر پر صَرف کر دیں، اور آخر میں اُس سے کہا: "تم اُس ٹن ٹن یا چُن چُن سے اتنا پیار کیوں کرتا ہے۔۔۔ حرام خور، وہ بھی کوئی کُتا ہے۔۔۔ تُم سے زیادہ بدشکل ہے۔۔۔ اتنا بدشکل کہ اُس کو دیکھ کر نفرت پیدا ہوتا ہے۔"

شہباز خان سے مار کھا کر، اور اُس کی غصّے کی ساری باتیں سُن کر، گلگت خان اُوپر اپنی کوٹھڑی میں گیا ــــــ اُس کے کانوں میں کالج کی دونوں لڑکیوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔

کوٹھڑی کے ایک کونے میں اُس کا ٹُن ٹُن لیٹا تھا، کچھ عجیب انداز سے، ٹانگیں دیوار کے ساتھ لگائے، جو اِس قدر ٹیڑھی تھیں کہ اور زیادہ ٹیڑھی ہو ہی نہیں سکتی تھیں۔

گلگت خان نے کچھ دیر غور کیا۔ اِس کے بعد اُس نے اپنا کمانی والا چاقو نکالا اور ٹُن ٹُن کی طرف بڑھا ـــــ مگر پھر اُسے کوئی اور خیال آیا۔ اُس نے کمانی والا چاقو بند کر کے اپنی جیب میں رکھا اور کُتّے کو بڑے پیار سے بُلا کر اپنے ساتھ لے گیا۔

جب گلگت خان اور ٹُن ٹُن ریلوے لائن کے پاس پہنچے تو گاڑی آ رہی تھی۔

گلگت خان نے اپنے پیارے کُتّے کو حکم دیا کہ وہ پٹڑیوں کے عین درمیان کھڑا ہو جائے۔

اس دن ٹُن ٹُن نے اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کی۔

گاڑی پُوری رفتار سے آ رہی تھی۔

ٹُن ٹُن پٹڑیوں کے عین درمیان کھڑا گلگت خان کی طرف دیکھ رہا تھا، ایسی نگاہوں سے، جن سے وفاداری ٹپک رہی تھی۔

گلگت خان نے ایک نظر اپنی طرف دیکھا ـــــ اُس نے محسوس کیا کہ اُس کا کُتّا اُس سے کہیں زیادہ خوش شکل ہے۔

گاڑی قریب آئی تو اُس نے ٹُن ٹُن کو دھکا دے کر پٹڑیوں سے باہر گرا دیا اور خود گاڑی کی جھپٹ میں آ گیا ـــــ اُس کا بالکل قیمہ ہو گیا۔

کُتّے نے گوشت کے اُس ڈھیر کو سُونگھا اور زور زور سے بڑی دردناک آواز میں رونے لگا۔

اصلی جن

لکھنؤ کے پچھلے دنوں کی یاد نواب نازش علی اللہ کو پیارے ہوئے تو ان کی اکلوتی لڑکی کی عمر زیادہ سے زیادہ آٹھ برس تھی ——— اکہرے جسم کی، بڑی دُبلی پتلی، نازک، پتلے پتلے نقشوں والی گُڑیا سی ——— نام اُس کا فرخندہ تھا۔

اُس کو اپنے والد کی موت کا دُکھ ہوا، مگر عمر ایسی تھی کہ بہت جلد بھول گئی ——— لیکن اُس کو اپنے دُکھ کا شدید احساس اُس وقت ہوا جب اُس کے میٹھا برس لگا اور اُس کی ماں نے اُس کا باہر آنا جانا قطعی طور پر بند کر دیا اور اُس پر کڑے پردے کی پابندی عائد کر دی ——— اُس کو اب ہر وقت گھر کی چار دیواری میں رہنا پڑتا۔

اُس کا کوئی بھائی تھا نہ بہن ——— وہ اکثر تنہائی میں روتی اور خدا سے یہ گلہ کرتی کہ اُس نے بھائی سے اُسے کیوں محروم رکھا، اور پھر اُس کا ابا میاں اُس سے کیوں چھین لیا۔

ماں سے اُس کو محبت تھی، مگر ہر وقت اُس کے پاس بیٹھی وہ کوئی تسکین محسوس نہیں کرتی تھی۔ وہ چاہتی تھی، کوئی اور ہو، جس کے وجود سے اُس کی زندگی کی یک آہنگی دُور ہو سکے۔

وہ ہر وقت اُکتائی اُکتائی سی رہتی۔

اب اُس کو اٹھارواں برس لگ رہا تھا ــــ سالگرہ میں دس بارہ روز باقی تھے کہ پڑوس کا مکان، جو کچھ دیر سے خالی پڑا تھا، پنجابیوں کے ایک خاندان نے کرائے پر اُٹھا لیا۔ اُن کے آٹھ لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔ آٹھ لڑکوں میں سے دو بیاہے جا چکے تھے۔ باقی اسکول اور کالج میں پڑھتے تھے۔ لڑکی اِن چھیوں سے ایک برس بڑی تھی۔ بڑی تنومند بنی گئی۔ اپنی عمر سے دو ڈھائی برس زیادہ ہی دکھائی دیتی تھی۔ انٹرنس پاس کر چکی تھی۔ اِس کے بعد اُس کے والدین نے یہ مناسب نہ سمجھا تھا کہ اُسے مزید تعلیم دی جائے۔ معلوم نہیں، کیوں؟

اِس لڑکی کا نام نسیمہ تھا، لیکن اپنے نام کی رعایت سے وہ نرم و نازک اور سبک رفتار نہیں تھی۔ اُس میں بَلا کی پھرتی اور گرمی تھی۔ فرخندہ کو اِس مہین مہین مونچھوں والی لڑکی نے کوٹھے پر سے دیکھا، جب کہ وہ بے حد اُکتا کر کوئی ناول پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی ــــ دونوں کوٹھے ساتھ ساتھ تھے، چنانچہ چند جملوں ہی میں دونوں متعارف ہو گئیں۔

فرخندہ کو نسیمہ کی شکل صورت پہلی نظر میں قطعاً پُرکشش معلوم نہ ہوئی، لیکن جب اُس سے تھوڑی دیر گفتگو ہوئی تو اُسے اُس کا ہر خد و خال پسند آیا ــــ نسیمہ موٹے موٹے نقشوں والی تھی، جیسے کوئی جوان لڑکا ہے، جس کی مسیں بھیگ رہی ہیں۔ بڑی صحت مند، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، کشادہ سینہ مگر ابھاروں سے بہت حد تک خالی ــــ فرخندہ کو اُس کے بالائی لب پر مہین مہین بالوں کا غبار خاص طور پر پسند آیا ــــ چنانچہ اُن میں فوراً دوستی ہو گئی۔

نسیمہ نے اُس کے ہاتھ میں کتاب دیکھی تو پوچھا: "یہ ناول کیسا ہے؟"

فرخندہ نے کہا: "بڑا ذلیل قسم کا ہے . . . ایسے ہی مِل گیا تھا، اور میں تنہائی سے گھبرا گئی تھی۔ سوچا کہ چند صفحے پڑھ لوں۔"

نسیمہ نے وہ ناول فرخندہ سے لے لیا۔ واقعی بڑا گھٹیا سا تھا، مگر اُس نے رات کو بہت دیر جاگ کر پڑھا اور صبح نوکر کے ہاتھ فرخندہ کو واپس بھیج دیا۔

فرخندہ ابھی تک تنہائی محسوس کر رہی تھی۔ اور کوئی کام نہیں تھا، اِس لیے اُس نے سوچا، چلو چند اوراق دیکھ لیں ــــ کتاب کھولی تو اُس میں سے ایک رقعہ نکلا، جو اُس کے نام تھا، اور نسیمہ کا لکھا ہوا تھا۔

اُسے پڑھتے ہوئے فرخندہ کے تن بدن میں کپکپیاں دَوڑتی رہیں ــــ وہ فوراً کوٹھے پر گئی ــــ نسیمہ نے اُس سے کہا تھا کہ اگر وہ اُسے بُلانا چاہے تو اُس اینٹ کو، جو منڈیر سے اُکھڑی ہوئی تھی، زور زور سے کسی اور اینٹ کے ساتھ بجا دیا کرے، وہ فوراً آجائے گی۔

فرخندہ نے اینٹ بجائی تو نسیمہ ایک منٹ میں کوٹھے پر آگئی ــــ شاید وہ اپنے رقعے کے جواب کا انتظار کر رہی تھی ــــ آتے ہی وہ چار ساڑھے چار فٹ کی منڈیر پر مردانہ وار چڑھی اور دوسری طرف کُود کر فرخندہ سے لپٹ گئی، اور جھٹ سے اُس کے ہونٹوں کا ایک طویل بوسہ لے لیا۔

فرخندہ بہت خوش ہوئی ـــــ دیر تک دونوں گھل مل کے باتیں کرتی رہیں ـــــ نسیمہ اب اُسے اور زیادہ خوب صورت دکھائی دی۔ اُس کی ہر ادا، جو مردانہ طرز کی تھی، اُسے بے حد پسند آئی ـــــ اور وہیں فیصلہ ہو گیا کہ وہ تا دمِ آخر سہیلیاں بنی رہیں گی۔

سالگرہ کا دن آیا تو فرخندہ نے اپنی ماں سے اجازت طلب کی کہ کیا وہ اپنی ہمسائی کو، جو اُس کی سہیلی بن چکی ہے، بُلا سکتی ہے؟

اس کی ماں نے اپنے ٹھیٹ لکھنوی انداز میں کہا: "کوئی مضائقہ نہیں۔۔۔ بُلا لو۔۔۔ لیکن وہ مجھے پسند نہیں۔۔ مَیں نے دیکھا ہے، وہ لونڈوں کی طرح کد کڑے لگاتی رہتی ہے۔"

فرخندہ نے وکالت کی: "نہیں امی جان، وہ تو بہت اچھی ہے۔۔ جب ملتی ہے، بڑے اخلاق سے پیش آتی ہے۔"

نواب صاحب کی بیگم نے کہا: "مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس میں لڑکیوں کی کوئی نزاکت نہیں۔۔ تم اصرار کرتی ہو تو بُلا لو، لیکن اُس سے زیادہ ربط نہیں ہونا چاہیے۔"

فرخندہ اپنی ماں کے پاس تخت پر بیٹھ گئی اور اُس کے ہاتھ سے سروتا لے کر چھالیا کاٹنے لگی: "لیکن امی جان، ہم دونوں تو قسم کھا چکی ہیں کہ ساری عمر سہیلیاں رہیں گی۔۔۔ انسان کو اپنے وعدے سے کبھی پھرنا نہیں چاہیے۔"

بیگم صاحبہ خود اصول کی پکی تھیں، اِس لیے اُنھوں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور صرف یہ کہہ کر خاموش ہو گئیں: "تم جانو، مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

سالگرہ کے دن نسیمہ آئی ـــــ اُس کی قمیص دھاری دار پوپلین کی تھی۔ چست پائجامہ جس میں سے اُس کی مضبوط پنڈلیاں اپنی تمام مضبوطی دکھا رہی تھیں۔

فرخندہ کو وہ اُس لباس میں بہت پیاری لگی، چنانچہ اُس نے اپنی تمام نسوانی نزاکتوں کے ساتھ اُس کا استقبال کیا اور اُس سے چند ناز نخرے بھی کیے۔ مثال کے طور پر جب میز پر چائے آئی تو اُس نے خود بنا کر نسیمہ کو پیش کی ـــــ اُس نے کہا، "مَیں نہیں پیتی"، تو فرخندہ رونے لگی۔ بسکٹ اپنے دانتوں سے توڑا تو نسیمہ کو مجبور کیا کہ وہ اُس کا بقایا حصہ کھائے۔ سموسہ مُنہ میں رکھا تو اُس سے کہا کہ وہ آدھا اُس کے مُنہ کے ساتھ مُنہ لگا کر کھائے۔

ایک آدھ مرتبہ معمولی معمولی باتوں پر لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی، مگر فرخندہ خوش تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ نسیمہ ہر روز آئے۔ وہ اُس سے چہل کرے اور ایسی نرم و نازک لڑائیاں ہوتی رہیں، جن سے اُس کی ٹھہرے پانی ایسی زندگی میں چند لہریں پیدا ہوتی رہیں۔

لہریں پیدا ہونا شروع ہو گئیں اور اُن میں فرخندہ اور نسیمہ، دونوں لہرانے لگیں۔

اب فرخندہ نے بھی اپنی امی سے اجازت لے کر نسیمہ کے گھر جانا شروع کر دیا۔ دونوں اُس کمرے میں جو نسیمہ کا تھا، دروازہ بند کر کے گھنٹوں بیٹھی رہتیں ـــــ جانے کیا باتیں کرتی تھیں۔

ان کی محبت اتنی شدت اختیار کر گئی کہ فرخندہ جب کوئی چیز خریدتی تو نسیمہ کا ضرور خیال رکھتی ــــ اس کی امی اس کے خلاف تھی۔ چونکہ فرخندہ اکلوتی تھی، اس لیے وہ اسے رنجیدہ نہیں کرنا چاہتی تھی ــــ دولت کافی تھی، اس لیے کیا فرق پڑتا تھا کہ ایک کے بجائے دو قمیصوں کا کپڑا خرید لیا، فرخندہ کی دس شلواروں کے لیے سفید ساٹن لی ہے تو نسیمہ کے لیے پانچ شلواروں کے لیے لٹھا لے لیا۔

نسیمہ کو ریشمیں ملبوس پسند نہیں تھے۔ اس کو سوتی کپڑے پہننے کی عادت تھی ــــ وہ فرخندہ سے وہ تمام چیزیں لے لیتی، مگر شکریہ ادا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتی۔ صرف مسکرا دیتی، اور ان تحفے وصول کر کے فرخندہ کو اپنی بانہوں کی مضبوط گرفت میں بھینچ لیتی اور اُس سے کہتی: "میرے ماں باپ غریب ہیں۔۔۔ اگر غریب نہ ہوتے تو میں تمہارے خوبصورت بالوں میں ہر روز اپنے ہاتھوں سے سونے کی کنگھی کرتی۔۔۔ تمہاری سینڈلیں چاندی کی ہوتیں۔۔۔ تمہارے غسل کے لیے معطر پانی ہوتا۔۔۔ تمہاری بانہوں میں میری بانہیں ہوتیں اور ہم جنت کی تمام منزلیں طے کر کے دوزخ کے دہانے تک پہنچ جاتے۔"

معلوم نہیں، وہ جنت سے جہنم تک کیوں پہونچنا چاہتی تھی۔ وہ جب بھی فردوس کا ذکر کرتی تو دوزخ کا ذکر ضرور آتا ــــ فرخندہ کو شروع شروع میں تھوڑی سی حیرت اس کے متعلق ضرور ہوئی، مگر بعد میں جب وہ نسیمہ سے گھُل مل گئی تو اُس نے محسوس کیا کہ ان دونوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔ سردی سے نکل کر اگر آدمی گرمی میں جائے تو اُسے ہر لحاظ سے راحت ملتی ہے اور فرخندہ کو یہ حاصل ہوتی تھی۔

اُن کی دوستی دن بدن زیادہ اُستوار ہوتی گئی، بلکہ یوں کہیے کہ بڑی شدت اختیار کر گئی، جو نواب نوازش علی مرحوم کی بیگم کو بہت کھلتی تھی۔ بعض اوقات وہ یہ محسوس کرتی کہ نسیمہ اُس کی سوت ہے، لیکن یہ احساس اُس کو باوقار معلوم نہ ہوتا۔

فرخندہ اب زیادہ تر نسیمہ کے پاس رہتی ــــ صبح اٹھ کر وہ کوٹھے پر جاتی۔ نسیمہ اُسے اٹھا کر منڈیر کے اُس طرف لے جاتی اور پھر دونوں کمرے میں بند گھنٹوں جانے کن باتوں میں مشغول رہتیں۔

فرخندہ کی دو سہیلیاں اور بھی تھیں، بڑی مُردار قسم کی ــــ وہ یُوپی کی رہنے والی تھیں۔ جسم چھیچھڑا سا۔ دو پتلی تُوپیاں سی معلوم ہوتی تھیں۔ پھونک مارو تو اُڑ جائیں۔

نسیمہ سے تعارف ہونے سے پہلے یہ دونوں اُس کی جان و جگر تھیں، مگر اب فرخندہ کو اُن سے کوئی لگاؤ نہیں رہا تھا، بلکہ وہ چاہتی تھی کہ وہ نہ آیا کریں، اس لیے کہ ان میں کوئی جان نہیں تھی ــــ نسیمہ کے مقابلے میں وہ ننھی منی چوہیاں تھیں، جو کترنا بھی نہیں جانتی ہیں۔

ایک بار اُسے مجبوراً اپنی ماں کے ساتھ کراچی جانا پڑا، وہ بھی فوری طور پر ــــ نسیمہ گھر میں موجود نہیں تھی۔ اس کا فرخندہ کو بہت افسوس ہوا، چنانچہ کراچی پہنچتے ہی اُس نے نسیمہ کو ایک طویل معذرت نامہ لکھا۔ اس سے پہلے وہ تار بھیج چکی تھی۔ اُس نے خط میں سارے حالات درج کردیے اور یہ بھی لکھا: "تمہارے بغیر میری زندگی یہاں

بے کیف ہے۔ کاش تم بھی میرے ساتھ آتیں"

اُس کی والدہ کو کراچی میں بہت کام تھے، مگر اُس نے اُسے کچھ بھی نہ کرنے دیا۔ دن میں کم از کم سو مرتبہ کہتی "میں اداس ہوگئی ہوں۔ یہ بھی کوئی شہروں میں شہر ہے۔ یہاں کا پانی پی کر میرا ہاضمہ خراب ہوگیا ہے۔۔۔ اپنا کام جلدی ختم کیجیے اور چلیے لاہور"

نواب نازش علی کی بیگم نے سارے کام ادھورے چھوڑ دیے اور واپس چلنے پر رضامند ہوگئی ——— اب فرخندہ نے کہا "اب جانا ہے تو ذرا شوپنگ کر لیں۔۔۔ یہاں کپڑا اور دوسری چیزیں سستی اور اچھی ملتی ہیں"

شوپنگ کی گئی ——— فرخندہ نے اپنی سہیلی نسیمہ کے لیے، دس سلیکس کے لیے بہترین ڈیزائن کا کپڑا خریدا، ڈائنگ شو لیے، ایک گھڑی خریدی، جو نسیمہ کی چوڑی کلائی کے لیے مناسب و موزوں تھی ——— ماں خاموش رہی کہ فرخندہ ناراض نہ ہوجائے۔

فرخندہ کراچی سے لاہور پہنچی تو سفر کی تکان کے باوجود فوراً نسیمہ سے ملی، مگر اُس کا منہ سُوجا ہوا تھا۔ وہ سخت ناراض تھی کہ فرخندہ اُس سے ملے بغیر کیوں چلی گئی تھی۔

فرخندہ نے ہر طرح سے اُس کی دلجوئی کی، مگر وہ راضی نہ ہوئی ——— اِس پر فرخندہ نے زار و قطار رونا شروع کر دیا اور نسیمہ سے کہا کہ اگر وہ اِسی طرح ناراض رہی تو وہ کچھ کھا کے مر جائے گی ——— اِس کا فوری اثر ہوا اور نسیمہ نے اُس کو اپنے مضبوط بازوؤں میں سمیٹ لیا اور اُس کو چُومنے پچکارنے لگی۔

دیر تک دونوں سہیلیاں کمرہ بند کر کے بیٹھی پیار محبّت کی باتیں کرتی رہیں۔ اُس دن کے بعد اُن کی دوستی اور زیادہ مضبوط ہوگئی ——— مگر فرخندہ کی ماں نے محسوس کیا کہ اُس کی بیٹی کی صحت دن بدن خراب ہو رہی ہے۔ چنانچہ اُس نے اس کا گھر سے نکلنا بند کر دیا ——— اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرخندہ کو ہسٹریا ایسے دَورے پڑنے لگے۔

بیگم صاحبہ نے اپنی جان پہچان کی عورتوں سے مشورہ کیا تو اُنھوں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ لڑکی کو آسیب ہوگیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کوئی جن اُس پر عاشق ہوگیا ہے، جو اُس کو نہیں چھوڑتا ——— چنانچہ فوراً ٹونے ٹوٹکے کیے گئے، جھاڑنے والے بُلائے گئے، تعویذ گنڈے ہوئے، مگر بے سُود۔

فرخندہ کی حالت دن بدن غیر ہوتی گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ عارضہ کیا ہے۔ وہ دن بدن دُبلی ہو رہی تھی۔ کبھی گھنٹوں خاموش رہتی، کبھی زور زور سے چلّانا شروع کر دیتی اور اپنی سہیلی نسیمہ کو یاد کر کے پہروں آنسو بہاتی۔

اُس کی ماں کو، جو زیادہ ضعیف الاعتقاد نہیں تھی، اپنی جان پہچان کی عورتوں کی اِس بات پر یقین کرنا پڑا کہ لڑکی پر کوئی جن عاشق ہے، اِس لیے کہ فرخندہ عشق و محبت کی بہت زیادہ باتیں کرتی تھی اور بڑے ٹھنڈے ٹھنڈے سانس بھرتی تھی۔

ایک مرتبہ پھر کوشش کی گئی۔ بڑی دُور دُور سے جھاڑنے والے بُلائے گئے، دوا دارو بھی کیا گیا، مگر کوئی

فائدہ نہ ہوا —— فرخندہ بار بار التجا کرتی کہ اس کی سہیلی نسیمہ کو بُلایا جائے، مگر اس کی ماں ٹالتی رہی۔

آخر ایک روز فرخندہ کی حالت بہت بگڑ گئی۔ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کی والدہ، جو کبھی اکیلی باہر نہیں نکلی تھی، برقع اوڑھ کر ایک ہمسائی کے ہاں گئی اور اس سے کہا کہ وہ کچھ کرے —— دونوں بھاگم بھاگ فرخندہ کے کمرے میں پہنچیں، مگر وہ موجود نہیں تھی۔

نواب نوازش علی مرحوم کی بیگم نے چیخنا چلاّنا اور دیوانہ وار "فرخندہ بیٹی، فرخندہ بیٹی" کہتے ہوئے پکارنا شروع کر دیا —— سارا گھر چھان مارا، مگر وہ نہ ملی۔ اس پر وہ اپنے بال نوچنے لگی۔ ہمسائی نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے، مگر وہ برابر واویلا کرتی رہی۔

فرخندہ نیم دیوانگی کے سے عالم میں اوپر کوٹھے پر کھڑی تھی —— اس نے منڈیر کی اکھڑی ہوئی اینٹ اٹھائی اور زور زور سے اُسے دوسری اینٹ کے ساتھ بجایا۔

کوئی نہ آیا۔

اس نے پھر اینٹ کو دوسری اینٹ کے ساتھ ٹکرایا۔

چند لمحات کے بعد ایک خوب صورت نوجوان، جو نسیمہ کے چھ کنوارے بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور برساتی میں بیٹھا بی۔ اے۔ کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا، باہر نکلا —— اس نے دیکھا کہ منڈیر کے اس طرف ایک دُبلی پتلی، نازک اندام لڑکی کھڑی ہے۔ بڑی پریشان حال، بال کھلے ہیں، ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں، آنکھوں میں سینکڑوں زخمی اُمنگیں سمٹی ہیں۔

قریب آ کر اس نے فرخندہ سے پوچھا "کسے بلا رہی ہیں آپ؟"

فرخندہ نے اس نوجوان کو بڑی گہری دلچسپی اور غور سے دیکھا: "میں نسیمہ کو بلا رہی تھی۔"

نوجوان نے صرف اتنا کہا: "اوہ ۔ ۔ ۔ چلو، آؤ ۔ ۔ ۔" اور یہ کہہ کر اس نے منڈیر کے اس طرف سے ہلکی پھلکی فرخندہ کو اٹھایا اور برساتی میں لے گیا، جہاں وہ کچھ دیر پہلے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔

دوسرے دن جن غائب ہو گیا —— فرخندہ بالکل ٹھیک تھی۔

اگلے مہینے اس کی شادی نسیمہ کے اُسی بھائی سے ہو گئی، جس میں نسیمہ شریک نہ ہوئی۔

مِسز گُل
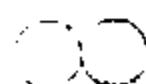
میں نے جب اُس عورت کو پہلی مرتبہ دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے لیموں نچوڑنے والا کھٹکا دیکھا ہے۔ بہت دُبلی پتلی، لیکن بلا کی تیز۔ اُس کا سارا جسم، سوائے آنکھوں کے، انتہائی غیر نسوانی تھا۔

یہ آنکھیں بڑی بڑی اور سُرمئی تھیں، جن میں شرارت، دغابازی اور فریب کاری کُوٹ کُوٹ کے بھری ہوئی تھی ——— میری اور اُس کی ملاقات اُونچی سوسائٹی کی ایک خاتون کے گھر میں ہوئی، جو پچپن برس کی عمر میں ایک جواں سال مرد سے شادی کے مرحلے طے کر رہی تھیں۔

اِس خاتون سے، جس کو میں اپنی اور آپ کی سہولت کی خاطر مِسز گُل کہوں گا، میرے بڑے بے تکلّف مراسم تھے۔ مجھے اُن کی ساری خامیوں کا عِلم تھا اور اُنھیں میری چند کا۔ بہرحال ہم دونوں ایک دوسرے سے ملتے اور گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔ مجھ سے اُنھیں صرف اتنی دلچسپی تھی کہ اُنھیں افسانے پڑھنے کا شوق تھا، اور میرے لکھے ہوئے افسانے اُن کو خاص طور پر پسند آتے تھے۔

میں نے جب اُس عورت کو، جو صرف اپنی آنکھوں کی وجہ سے عورت کہلائے جانے کی مستحق تھی، مسز گُل کے فلیٹ میں دیکھا تو مجھے ڈر محسوس ہوا کہ وہ میری زندگی کا سارا رس ایک دو باتوں ہی میں نچوڑ لے گی۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد یہ خوف دُور ہوگیا اور میں نے اُس سے باتیں شروع کر دیں۔

مسز گُل کے متعلق میرے جو خیالات پہلے تھے، سو اب بھی ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ تین شادیاں کرنے کے بعد چوتھی شادی ضرور کریں گی۔ اُس کے بعد شاید پانچویں بھی، اگر عمر نے اُن سے وفا کی۔ مگر مجھے اُس عورت کا جس کا میں اُوپر ذکر کر چکا ہوں، اُن سے کوئی رشتہ سمجھ میں نہ آسکا۔

میں اب اُس عورت کا نام بھی آپ کو بتا دوں ـــــ مسز گُل نے اُسے "رضیہ" کہہ کے پکارا تھا ـــــ اُس کا لباس عام نوکرانیوں کا سا نہیں تھا، لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ مسز گُل کے مزارعوں کی کوئی بہو بیٹی ہے، جو اُن کی خدمت کے لیے کبھی کبھار آجایا کرتی ہے ـــــ یہ خدمت کیا تھی، اس کے متعلق مجھے پہلے کوئی علم نہیں تھا۔

رضیہ کی آمد سے پہلے مسز گُل کے ہاں بارہ تیرہ برس کی ایک لڑکی جمیلہ رہتی تھی۔ اُن دنوں انھوں نے ایک پروفیسر صاحب سے شادی کر رکھی تھی۔ یہ پروفیسر صاحب جوان تھے۔ کم از کم مسز گُل سے عمر میں پچیس برس چھوٹے۔ وہ جمیلہ کو "بیٹا" کہتے تھے اور اس سے بڑا پیار کرتے تھے۔

یہ لڑکی بڑی پیاری سی تھی۔ رضیہ کی طرح دُبلی پتلی، مگر اُس کے جسم کا کوئی حصّہ غیر نسوانی نہیں تھا۔ اس کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا کہ وہ بہت جلد، معلوم نہیں اتنی جلدی کیوں، جوان عورت میں تبدیل ہونے کی تیاریاں کر رہی ہے۔

پروفیسر صاحب اُس کو اکثر اپنے پاس بلاتے، اور ہر دوسرے تیسرے کام پہ انعام کے طور پر اُس کی پیشانی چومتے اور شاباشیاں دیتے۔ مسز گُل بہت خوش ہوتیں، اس لیے کہ یہ لڑکی اُن کی پروردہ تھی۔

میں بیمار ہوگیا۔ دو مہینے مری میں گزار کر جب واپس آیا تو معلوم ہوا کہ جمیلہ غائب ہے۔ شاید وہ مسز گُل کی میکے پر واپس چلی گئی تھی ـــــ لیکن دو برس کے بعد میں نے اُسے ایک ہوٹل میں دیکھا، جہاں وہ چند عیش پرستوں کے ساتھ شراب پی رہی تھی۔

اُس وقت اُس کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ اُس نے اپنی بلوغت، نیم بلوغت کہنا زیادہ مناسب ہوگا، کا زمانہ بڑی افراتفری میں طے کیا ہے، جیسے کسی مہاجر نے فسادات کے دوران میں ہندوستان سے پاکستان کا سفر۔

میں نے اُس سے کوئی بات نہ کی، اس لیے کہ جن کے ساتھ وہ بیٹھی تھی، میری جان پہچان کے نہیں تھے۔ نہ میں نے اس کا ذکر مسز گُل سے کیا، کیونکہ وہ جمیلہ کی اس حیرت ناک افتاد پر کوئی روشنی نہ ڈالتی۔

بات رضیہ کی ہو رہی تھی، لیکن جمیلہ کا ذکر ضمناً آگیا، شاید اس لیے کہ اس کے بغیر مسز گُل کے کردار کا عقبی منظر پُورا نہ ہوتا۔

رضیہ سے جب میں نے باتیں شروع کیں تو اُس کا لب و لہجہ اُس کی آنکھوں کے مانند تیز، فریب کار اور بے سبب

رنج آشنا دشمن تھا ـــــ مجھے بالکل کوفت نہ ہوئی، اس لیے کہ ہر نئی چیز میرے لیے دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔
عام طور پر میں کسی عورت سے بھی، خواہ وہ کم سِن ہو، بے تکلّف نہیں ہوتا، لیکن رضیہ کی آنکھوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں بھی اُس سے چند شریر باتیں کہوں۔
خدا معلوم میں نے اُس سے کیا بات کہی کہ اُس نے مجھ سے پُوچھا؟ "آپ کون ہیں؟"
میں نے، جو کہ شرارت پر تُلا بیٹھا تھا، مسز گُل کی موجودگی میں کہا؟ "آپ کا ہونے والا شوہر۔"
وہ ایک لحظے کے لیے بھنّا گئی، مگر فوراً سنبھل کر مجھ سے مخاطب ہوئی؟ "میرا کوئی شوہر اب تک زندہ نہیں رہا۔"
میں نے کہا: کوئی حرج نہیں . . . خاکسار کافی عرصے تک زندہ رہنے کا وعدہ کرتا ہے بشرطیکہ آپ کو کوئی عذر نہ ہو۔"
مسز گُل نے یہ چوٹیں پسند کیں اور ایک جھریوں والا قہقہہ بلند کیا؟ سعادت، تم کیسی باتیں کرتے ہو۔"
میں نے جواباً مسز گُل سے کہا؟ مجھے آپ کی یہ خادمہ بھا گئی ہے . . . میں چاہتا ہوں کہ اس کا قیمہ بنا کے کوفتہ بناؤں، جن میں کالی مرچ، دھنیا اور پودینہ خوب رچا ہو ـــــ"
میری بات کاٹ دی گئی۔ رضیہ اچک کر بولی؟ جناب، میں خود بڑی تتّیا مرچ ہوں . . . یہ کوفتے آپ کو ہضم نہیں ہوں گے۔ فساد مچا دیں گے آپ کے معدے کے اندر۔"
مسز گُل نے ایک اور جھرّیوں والا قہقہہ بلند کیا؟ سعادت، تم بڑے شریر ہو لیکن یہ رضیہ بھی کسی طرح تم سے کم نہیں۔"
مجھے چونکہ رضیہ کی بات کا جواب دینا تھا۔ اس لیے میں نے مسز گُل کے اُس جملے کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور کہا؟ رضیہ، میرا معدہ تم ایسی مرچوں کا بہت دیر کا عادی ہے۔"
یہ سُن کر رضیہ خاموش ہو گئی۔ معلوم نہیں، کیوں ـــــ اُس نے مجھے اپنی دھوئی دھوئی ہوئی، مگر مرگیں آنکھوں سے کچھ ایسے دیکھا کہ ایک لحظے کے لیے مجھے یُوں محسوس ہوا کہ میری ساری زندگی دھوبنوں کے ہاں چلی گئی ہے۔
معلوم نہیں کیوں، لیکن اُس کو پہلی مرتبہ دیکھتے ہی میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی تھی کہ میں اُسے، جو ایک چھوٹا سا کنکر تھی، سڑکیں کوٹنے والا انجن بن کر ایسا دباؤں کہ وہ چکنا چور ہو جائے، بلکہ اُس کا سفوف بن جائے ـــــ یا میں اُس کے سارے وجود کو اِس طرح توڑوں مروڑوں اور پھر اِسی بھونڈے طریقے پر جوڑوں کہ وہ کسی قدر نسوانیت اختیار کرے۔ مگر یہ خواہش صرف اُس وقت پیدا ہوتی ـــ جب میں اسے دیکھتا۔ اس کے بعد یہ غائب ہو جاتی۔
انسانی خواہشات بالکل بلبلوں کے مانند ہوتی ہے، جو معلوم نہیں کیوں پیدا ہوتے ہیں اور کیوں پھٹ کر ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔

مجھے رضیہ پر ترس بھی آتا تھا، اس لیے کہ اُس کی آنکھوں میں جوالا دہکتی رہتی تھی، اور اس کے مقابلے میں اُس کا جسم آتش فشاں پہاڑ نہیں تھا ـــــــ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی، اور اُن ہڈیوں کو چبانے کے لیے کتّوں کے دانتوں کی ضرورت تھی۔

ایک دن اُس سے میری ملاقات مسز گُل کے فلیٹ کے باہر ہوئی، جب کہ میں اندر جا رہا تھا ـــــــ وہ ہمارے محلّے کی جوان بھنگن کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھی۔

میں جب وہاں سے گزرنے لگا تو شرارت کے طور پر میں نے اُس کی شریر آنکھوں میں اپنی آنکھیں ـــــــ معلوم نہیں، میری آنکھیں کس قسم کی تھیں ـــــــ ڈال کر بڑے عاشقانہ انداز میں پوچھا! "کہو بادشاؤ، کیا ہو رہا ہے؟"

بھنگن کی گود میں اُس کا پہلوٹھی کا لڑکا تھا۔ اُس کی طرف دیکھ کر رضیہ نے مجھ سے کہا: "کوئی چیز کھانے کے لیے مانگتا ہے۔"

میں نے اُس سے کہا: "چند بوٹیاں تمہارے جسم پر ابھی تک موجود ہیں . . . دے دو اسے۔"

میں نے پہلی بار اُس کے دھوئے ہوئے دیدوں میں دُکھ کی عجیب و غریب قسم کی جھلک دیکھی، جسے میں سمجھ نہ سکا۔

مسز گُل کے ہاں اُن دنوں جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ ایک نئے نوجوان کی آمد تھی، اِس لیے کہ وہ پروفیسر صاحب سے طلاق لے چکی تھیں اور نئی شادی کے مرحلے طے کر رہی تھیں ـــــ یہ صاحب ریلوے میں ملازم تھے اور اِن کا نام شفیق اللہ تھا۔ مسز گُل کے بیان کے مطابق آپ کو دمے کی شکایت تھی، اس لیے وہ ہر وقت ان کے علاج معالجے میں مصروف رہتیں۔ کبھی اُن کو ٹکیاں دیتیں، کبھی انجکشن لگوانے کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے جاتیں، اور کبھی اُن کے گلے میں دوائی لگائی جاتی۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، وہ اِس عارضے میں گرفتار نہیں تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اُن کو کبھی نزلہ زکام ہوا ہو، یا شاید کھانسی بھی آئی ہو، لیکن یہ مسز گُل کا کمال تھا کہ وہ غریب یقین کر بیٹھے تھے کہ اُن کو دمے کا عارضہ ہے۔

ایک دن میں نے اُن سے کہا: "حضرت، آپ کو یہ مرض تو بہت اچھا لگا . . . اِس لیے کہ اِس بات کی ضمانت ہے کہ آپ کبھی مر نہیں سکتے۔"

یہ سُن کر وہ حیران ہو گئے: "آپ کیسے کہتے ہیں کہ یہ مرض اچھا ہے؟"

میں نے جواب دیا: "ڈاکٹروں کا یہ کہنا ہے کہ دمے کا مریض مرنے کا نام ہی نہیں لیتا . . . میں نہیں بتا سکتا کیوں . . . آپ ڈاکٹروں سے مشورہ کر سکتے ہیں۔"

رضیہ موجود تھی۔ اُس نے شریر انکھیوں سے مجھے بہت گھور کے دیکھا۔ پھر اُس کی نگاہیں اپنی مالکہ مسز گُل کی طرف مڑیں اور اُس سے کچھ بھی نہ کہہ سکیں۔

شفیق اللہ مرے کھرے چُپ چاپ بیٹھے تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ زخمی آنکھوں سے رضیہ کی طرف دیکھا اور

وہ کُڑک مرغی کی طرح ایک طرف دُبک کے بیٹھ گئی ــــــ میں نے محسوس کیا کہ وہ پہلے سے کہیں زیادہ دُبلی ہوگئی ہے، لیکن اُس کی آنکھیں بڑی متحرک تھیں۔ اُن میں سُرمے کی قدرتی تحریر زیادہ گہری ہوگئی تھی۔

شفیق اللہ بھی دن بدن زرد ہوتے گئے۔ اُن کو دمے کے علاج کے لیے دوائیں برابر مل رہی تھیں ــــــ ایک دن میں نے مسز گل سے کیپسولز کی بوتل لی اور چپکے سے ایک کیپسول نکال کر اپنے پاس رکھ لی۔ شام کو اپنے جاننے والے ایک ڈاکٹر کو دکھائی تو اُس نے ایک گھنٹے کے بعد، کیمیاوی تجربہ کرنے کے بعد بتایا کہ وہ دوا دمے کے لیے نہیں ہے، بلکہ کوئی نشہ آور دوا ہے، یعنی مورفیا ہے۔

میں نے دوسرے روز شفیق اللہ سے، اُس وقت جبکہ وہ مسز گل سے وہی کیپسول لے کر پانی کے ساتھ نگل رہے تھے، کہا: "یہ آپ کیا کھاتے ہیں؟"

اُنھوں نے جواب دیا: "یہ دمے کی دوا ہے۔"

"یہ تو مورفیا ہے۔"

مسز گل کے ہاتھ سے پانی کا گلاس، جو اُنھوں نے شفیق اللہ کے ہاتھ سے واپس لے لیا تھا، گرتے گرتے بچا۔ بڑے جھرّیوں آمیز غصّے سے اُنھوں نے میری طرف دیکھ کر کہا: "کیا کہہ رہے ہو سعادت؟"

میں اُن سے مخاطب نہ ہوا اور شفیق اللہ سے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا: "جناب یہ مورفیا ہے... آپ کو اگر اِس کی عادت ہوگئی تو مصیبت پڑ جائے گی۔"

شفیق اللہ نے بڑی حیرت سے پوچھا: "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"

مسز گل کے تیوروں سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ ناراض ہوگئی ہیں، اور میری یہ گفتگو انھیں پسند نہیں۔ رضیہ خاموش ایک کونے میں مسز گل کے لیے حقّہ تیار کر رہی تھی، لیکن اُس کے کان ہماری گفتگو کے ساتھ چپکے ہوئے تھے، ایسے کان جو بڑی ناخوش گوار موسیقی سُننے کے لیے مجبور ہوں۔

مسز گل نے اِس دَوران میں بڑی تیزی سے چار الائچیاں دانتوں کے نیچے یکے بعد دیگرے دبائیں اور اُنھیں بڑی بے رحمی سے چباتے ہوئے مجھ سے کہا: "سعادت، تم بعض اوقات بڑی بے ہودہ باتیں کرتے ہو... یہ کیپسول مورفیا کے کیسے ہو سکتے ہیں؟"

میں خاموش رہا، بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ مورفیا کا انجکشن دیا جاتا ہے۔ میرے ڈاکٹر دوست کا تجزیہ غلط تھا۔ وہ کوئی اور دوا تھی، لیکن تھی نشہ آور۔

میں پھر بیمار ہوا اور راول پنڈی کے ہسپتال میں داخل ہوگیا ــــــ جب مجھے ذرا افاقہ ہوا تو میں نے اِدھر اُدھر گھومنا شروع کر دیا۔ ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ ایک آدمی شفیق اللہ کی حالت بہت نازک ہے۔ میں اُس کے وارڈ میں پہنچا، مگر وہ، شفیق اللہ نہیں تھے، جنھیں میں جانتا تھا ــــــ اُس نے دھتورا کھایا ہوا تھا۔

چند روز کے بعد اتفاقاً مجھے ایک اور وارڈ میں جانا پڑا، جہاں میرا ایک دوست یرقان میں مبتلا تھا۔

——میں جب اُس وارڈ میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک بستر کے اِرد گِرد کئی ڈاکٹر جمع ہیں۔ قریب گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ مرنے والا مریض شفیق احمد ہے۔

انھوں نے مجھے اپنی بجھتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور بڑی نحیف آواز میں کہا: "سعادت صاحب، ذرا میرے پاس آئیے۔۔۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

میں نے اپنے قریب بہرے کان اُن کی آواز سُننے کے لیے تیار کر دئے —— وہ کہہ رہے تھے: "میں۔۔۔ میں مر رہا ہوں۔۔۔ آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔۔۔ ہر۔۔۔ ہر ایک کو خبردار کر دیجیے کہ وہ مسز گل سے بچا رہے۔۔۔ بڑی خطرناک عورت ہے۔۔۔"

اس کے بعد وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہو گئے۔ ڈاکٹر نہیں چاہتے تھے کہ وہ کوئی بات کریں، لیکن وہ مصر تھے، چنانچہ اُنھوں نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا کیے: "رضیہ مر گئی ہے۔۔۔ بے چاری رضیہ۔۔۔ اُس غریب کے سپرد یہی کام تھا کہ وہ آہستہ آہستہ مرے۔۔۔ مسز۔۔۔ مسز گل اُس سے وہی کام لیتی تھی، جو آدمی کوئلوں سے لیتا ہے۔ مگر وہ اُن کی آگ سے دوسری کو گرمی پہنچاتی تھی، تاکہ۔۔۔ ۔۔۔"

وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکے۔

ڈاکٹر شروڈکر

بمبئی میں ڈاکٹر شروڈکر کا بہت نام تھا، اِس لیے کہ وہ عورتوں کے امراض کا بہترین معالج تھا۔ اُس کے ہاتھ میں شفا تھی۔ اُس کا شفاخانہ بہت بڑا تھا، ایک عالیشان عمارت کی دو منزلوں میں، جن میں کئی کمرے تھے۔ نچلی منزل کے کمرے متوسط اور نچلے طبقے کی عورتوں کے لیے مخصوص تھے۔ بالائی منزل کے کمرے امیر عورتوں کے لیے۔

ایک لیبارٹری تھی اور اُس کے ساتھ ہی کمپاؤنڈر کا کمرہ۔ ایکس رے کا کمرہ علیحدہ تھا ـــــ اس کی ماہانہ آمدن ڈھائی تین ہزار کے قریب ہوگی۔

مریض عورتوں کے کھانے کا انتظام بہت اچھا تھا، جو اُس نے ایک پارسن کے سپرد کر رکھا تھا، جو اُس کے ایک دوست کی بیوی تھی۔

ڈاکٹر شروڈکر کا یہ چھوٹا سا ہسپتال، میٹرنٹی ہوم بھی تھا ـــــ بمبئی کی آبادی کے متعلق آپ اندازہ لگا سکتے ہیں، کتنی ہوگی۔ وہاں بے شمار سرکاری ہسپتال اور میٹرنٹی ہوم ہیں، لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر شروڈکر

کا کلینک بھرا رہتا. بعض اوقات تو اُسے کئی کیسوں کو مایوس کرنا پڑتا، اس لیے کہ کوئی بیڈ خالی نہیں رہتا تھا۔
اس پر لوگوں کو اعتماد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی بیویاں اور جوان لڑکیاں اُس کے ہسپتال میں چھوڑ آتے تھے۔ جہاں اُن کا بڑی توجہ سے علاج کیا جاتا تھا۔

ڈاکٹر شروڈ کر کے ہسپتال میں دس بارہ نرسیں تھیں. یہ سب کی سب محنتی اور پُر خلوص تھیں. مریض عورتوں کی بہت اچھی طرح دیکھ بھال کرتیں ـــــ ان نرسوں کا انتخاب ڈاکٹر شروڈ کر نے بڑی چھان بین کے بعد کیا تھا۔ ـــــ وہ بُری اور بھدّی شکل کی کوئی نرس اپنے ہسپتال میں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔

ایک مرتبہ جب چار نرسوں نے دفعتہً شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو ڈاکٹر بہت پریشان ہوا ـــــ جب وہ چاروں چلی گئیں تو اُس نے مختلف اخباروں میں اشتہار دیے کہ اُسے نرسوں کی ضرورت ہے. کئی آئیں. ڈاکٹر شروڈ کر نے اُن سے انٹرویو کیا. مگر اُسے اُن میں کسی کی شکل پسند نہ آئی۔

کسی کا چہرہ ٹیڑھا میڑھا، کسی کا قد انگشتانے بھر کا، کسی کا رنگ خوفناک طور پر کالا، کسی کی ناک گز بھر لمبی ـــــ لیکن وہ بھی پتی نہیں کا پکا تھا. اُس نے اور اشتہار اخباروں میں دیے اور آخر اُس نے چار خوش شکل اور نفاست پسند نرسیں چُن ہی لیں۔

اب وہ مطمئن تھا. چنانچہ اُس نے پھر دل جمعی سے کام شروع کر دیا. مریض عورتیں بھی خوش ہو گئیں، اس لیے کہ چار نرسوں کے چلے جانے سے اُن کی خبر گیری اچھی طرح نہیں ہو رہی تھی. یہ نئی نرسیں بھی خوش تھیں کہ ڈاکٹر شروڈ کر ان سے بڑی شفقت سے پیش آتا تھا۔ اُ میں وقت پر تنخواہ ملتی تھی. دوپہر کا کھانا ہسپتال ہی اُنھیں مہیا کرتا. وردی بھی ہسپتال کے ذمے تھی۔

ڈاکٹر شروڈ کر کی آمدن چونکہ بہت زیادہ تھی، اس لیے وہ اِن چھوٹے موٹے اخراجات سے گھبراتا نہیں تھا. شروع شروع میں جب اُس نے سرکاری ہسپتال کی ملازمت چھوڑ کر خود اپنا ہسپتال قائم کیا تو اُس نے تھوڑی بہت کنجوسی کی، مگر بہت جلد اس نے کُھل کر خرچ کرنا شروع کر دیا۔

اُس کا ارادہ تھا کہ شادی کرے، مگر اُسے ہسپتال سے ایک لمحے کی فرصت نہیں ملتی تھی ـــــ دن رات اس کو وہیں رہنا پڑتا. بالائی منزل میں اُس نے ایک چھوٹا سا کمرہ اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا جس میں وہ رات کو چند گھنٹے سو جاتا. لیکن اکثر اُسے جگا دیا جاتا جب کسی مریض عورت کو اُس کی فوری توجّہ کی ضرورت ہوتی۔

تمام نرسوں کو اُس سے ہمدردی تھی کہ اُس نے اپنی نیند، اپنا آرام حرام کر رکھا ہے۔ وہ اکثر اُس سے کہتیں:

"ڈاکٹر صاحب، آپ کوئی اسسٹنٹ کیوں نہیں رکھ لیتے؟"

ڈاکٹر شروڈ کر جواب دیتا: "جب کوئی قابل ملے گا تو رکھ لوں گا۔"

وہ کہتیں: "آپ تو اپنی قابلیت کا چاہتے ہیں۔ بھلا وہ کہاں سے ملے گا؟"

"مل جائے گا۔"

نرسیں یہ سُن کر خاموش ہو جاتیں اور الگ جا کر آپس میں باتیں کرتیں "ڈاکٹر شروڈکر اپنی صحت خراب کر رہے ہیں۔ کسی دن کہیں کو ئیپس نہ ہو جائیں"۔

"ہاں اُن کی صحت کافی گر چکی ہے۔۔۔ وزن بھی کم ہو گیا ہے"

"کھاتے پیتے بھی بہت کم ہیں"

"ہر وقت مصروف جو رہتے ہیں"

"اب انھیں کون سمجھائے"

قریب قریب ہر روز اُن کے درمیان اِسی قسم کی باتیں ہوتیں ــــــ اُن کو ڈاکٹر سے اس لیے بھی بہت زیادہ ہمدردی تھی کہ وہ بہت شریف النفس انسان تھا۔ اس کے ہسپتال میں سینکڑوں خوب صورت اور جوان عورتیں علاج کے لیے آتی تھیں، مگر اُس نے کبھی اُن کو بُری نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بس اپنے کام میں مگن رہتا۔

اصل میں اسے اپنے پیشے سے ایک قسم کا عشق تھا ــــــ وہ اِس طرح علاج کرتا تھا، جس طرح کوئی شفقت اور پیار کا ہاتھ کسی کے سر پر پھیرے۔

جب وہ سرکاری ہسپتال میں ملازم تھا تو اُس کے آپریشن کرنے کے عمل کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ نشتر نہیں چلاتا، برش سے تصویریں بناتا ہے۔

اور یہ واقعہ ہے کہ اُس کے لیے ہوئے آپریشن نوّے فی صد کامیاب رہتے تھے۔ اُس کو اِس فن میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ اِس کے علاوہ وہ خود اعتمادی بھی تھی، جو اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز تھی۔

ایک دِن وہ ایک عورت کا، جس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی، بڑے غور سے معائنہ کر کے باہر نکلا اور اپنے دفتر میں گیا تو اُس نے دیکھا کہ ایک بڑی حسین لڑکی بیٹھی ہے ــــــ ڈاکٹر شروڈکر ایک لحظے کے لیے ٹھٹک گیا۔ اس نے نسوانی حُسن کا ایسا نادر نمونہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

وہ اندر داخل ہوا ــــــ لڑکی نے کرسی پر سے اٹھنا چاہا ــــــ ڈاکٹر نے اُس سے کہا "بیٹھو بیٹھو" اور یہ کہہ کر وہ اپنی گھومنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر پیپرویٹ پکڑ کر اُس کے اندر ہوا کے بُلبُلوں کو دیکھتے ہوئے اُس لڑکی سے مخاطب ہوا: "بتاؤ، تم کیسے آئیں؟"

لڑکی نے آنکھیں جُھکا کر کہا "ایک پرائیویٹ۔۔۔ بہت ہی پرائیویٹ بات ہے جو میں آپ سے کرنا چاہتی ہوں"۔

ڈاکٹر شروڈکر نے اُس کی طرف دیکھا ــــــ اس کی جھکی ہوئی آنکھیں بھی بلا کی خوب صورت دِکھائی دے رہی تھیں ــــــ ڈاکٹر نے اُس سے پوچھا: "پرائیویٹ بات تم کر لینا۔۔۔ پہلے اپنا نام بتاؤ"۔

لڑکی نے جواب دیا "میں۔۔۔ میں اپنا نام بتانا نہیں چاہتی"

ڈاکٹر کی دلچسپی اِس جواب سے بڑھ گئی "کہاں رہتی ہو؟"

"شولاپور میں . . . آج ہی یہاں پہنچی ہوں "

ڈاکٹر نے پیپر ویٹ میز پر رکھ دیا "اتنی دور سے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے ؟"

لڑکی نے جواب دیا "میں نے کہا ہے نا کہ مجھے آپ سے ایک پرائیویٹ بات کرنی ہے "

تبھی ایک نرس اندر داخل ہوئی ـــــ لڑکی گھبرا گئی ـــــ ڈاکٹر نے اُس نرس کو چند ہدایات دیں، جو وہ پوچھنے آئی تھی پھر اُس نے نرس سے کہا "اب تم جا سکتی ہو . . . ہاں کسی نوکر سے کہہ دو کہ وہ کمرے کے باہر کھڑا رہے اور کسی کو اندر نہ آنے دے "

نرس "جی اچھا" کہہ کر چلی گئی ـــــ ڈاکٹر نے دروازہ بند کر دیا اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر اُس حسین لڑکی سے مخاطب ہوا "اب تم اپنی پرائیویٹ بات مجھے بتا سکتی ہو "

شولاپور کی لڑکی شدید گھبراہٹ اور اُلجھن محسوس کر رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر لفظ آتے، مگر پھر واپس اُس کے حلق کے اندر چلے جاتے ـــــ آخر اُس نے ہمت اور جرأت سے کام لیا اور رُک رُک کے صرف اتنا کہا: "مجھ سے . . . مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے . . . میں گھبرا رہی ہوں "

ڈاکٹر شروڈکر سمجھ گیا . لیکن پھر بھی اُس نے اُس لڑکی سے کہا "غلطیاں انسان سے ہو ہی جاتی ہیں . . . تم سے کیا غلطی ہوئی ہے ؟"

لڑکی نے تھوڑے وقفے کے بعد جواب دیا "وہی . . . وہی جو بے سمجھ جوان لڑکیوں سے ہوا کرتی ہے "

ڈاکٹر نے کہا "میں سمجھ گیا ہوں . . لیکن اب تم کیا چاہتی ہو ؟"

لڑکی فوراً اپنے مقصد کی طرف آ گئی "میں چاہتی ہوں کہ وہ ضائع ہو جائے . . . صرف ایک مہینہ ہوا ہے "

ڈاکٹر شروڈکر نے کچھ دیر سوچا، پھر بڑی سنجیدگی سے کہا "یہ جرم ہے . . . تم جانتی نہیں ہو "

لڑکی کی بھوری آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو اُمنڈ آئے "تو میں زہر کھا لوں گی " یہ کہہ کر اُس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر کو اُس پر بڑا ترس آیا ـــــ وہ اپنی جوانی کی پہلی لغزش کر چکی تھی . پتا نہیں، وہ کیا لمحات تھے کہ اُس نے اپنی عصمت کسی مرد کے حوالے کر دی اور اب پچھتا رہی ہے اور اتنی پریشان ہو رہی ہے۔

اُس کے پاس اِس سے پہلے ایسے کئی کیس آ چکے تھے . مگر اُس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ جیو ہتیا نہیں کر سکتا . یہ بہت بڑا گناہ اور جرم ہے۔

مگر شولاپور کی اُس لڑکی نے اُس پر کچھ ایسا جادو کیا کہ وہ اُس کی خاطر یہ جرم کرنے پر تیار ہو گیا [illegible] نے اُس کے لیے علیحدہ کمرہ مختص کر دیا . کسی نرس کو اُس کے اندر جانے کی اجازت نہ تھی ، اِس لیے کہ وہ [illegible] کے راز کو [illegible] نہیں چاہتا تھا۔

اسقاط بہت ہی تکلیف دہ ہوتا ہے ـــــ جب اُس نے دوائیاں وغیرہ دے کر وہ کام کر دیا تو نقاہت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے پانی بھی نہیں پی سکتی تھی۔

وہ چاہتی تھی کہ جلد گھر واپس چلی جائے، مگر ڈاکٹر اُسے کیسے اجازت دے سکتا تھا، جب کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہی نہیں تھی ـــــ اُس نے مس للیتا کھٹے کر سے کہا "تمھیں کم از کم دو مہینے آرام کرنا پڑے گا . . . مَیں تمھارے باپ کو لکھ دوں گا کہ تم جس سہیلی کے پاس آئی تھیں، وہاں اچانک طور پر بیمار ہو گئی تھیں اور اب میرے ہسپتال میں زیرِ علاج ہو . . . تردد کی کوئی بات نہیں۔"

للیتا مان گئی۔

وہ دو مہینے ڈاکٹر شروڈ کر کے زیرِ علاج رہی ـــــ جب رخصت کا وقت آیا تو اُس نے محسوس کیا کہ وہ گڑبڑ پھر پیدا ہو گئی ہے۔ اُس نے ڈاکٹر شروڈ کر کو اِس سے آگاہ کیا۔

ڈاکٹر مسکرایا "فکر کی کوئی بات نہیں . . . مَیں تم سے آج ہی شادی کر لوں گا۔"

چور
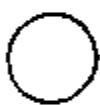
مجھے بے شمار لوگوں کا قرض ادا کرنا تھا اور یہ سب شراب نوشی کی بدولت تھا۔ رات کو جب میں سونے کے لیے چارپائی پر لیٹتا تو میرا ہر قرض خواہ میرے سرہانے موجود ہوتا ——— کہتے ہیں کہ شرابی کا ضمیر مُردہ ہو جاتا ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے ساتھ میرے ضمیر کا معاملہ کچھ اور ہی تھا۔ وہ ہر روز مجھے سرزنش کرتا اور میں خفیف ہو کے رہ جاتا۔

واقعی میں نے بیسیوں آدمیوں سے قرض لیا تھا ——— میں نے ایک رات سونے سے پہلے، بلکہ یوں کہیے کہ سونے کی ناکام کوشش کرنے سے پہلے حساب لگایا تو قریب قریب ڈیڑھ ہزار روپے میرے ذمّے نکلے۔ میں بہت پریشان ہوا۔ میں نے سوچا، یہ ڈیڑھ ہزار روپے کیسے ادا ہوں گے ؛ بیس پچیس روپے روزانہ کی آمدن ہے، اور وہ میری شراب کے لیے بمشکل کافی ہوتے ہیں۔

آپ یوں سمجھیے ناکہ ہر روز کی ایک بوتل ——— تھرڈ کلاس رَم کی ——— دام ملاحظہ ہوں : سولہ روپے ——— سولہ روپے تو ایک طرف رہے، اُن کے حاصل کرنے میں کم از کم تین روپے ٹانگے پر صرف ہو جاتے تھے ———

کام ہوتا نہیں تھا، بس پیشگی پر گذارہ تھا، لیکن جب پیشگی دینے والے تنگ آ لئے تو انھوں نے میری شکل دیکھتے ہی کوئی بہانہ تراش لیا، یا اس سے پیشتر کہ میں اُن سے ملوں، کہیں غائب ہو گئے۔ آخر کب تک وہ مجھے پیشگی دیتے رہتے —— لیکن میں مایوس نہ ہوتا اور خدا پر بھروسہ رکھ کے کسی نہ کسی حیلے سے دس پندرہ روپے اُدھار لینے میں کامیاب ہو جاتا۔

مگر یہ سلسلہ کب تک جاری رہ سکتا تھا۔ لوگ میری عزت کرتے تھے، مگر اب وہ میری شکل دیکھتے ہی بھاگ جاتے تھے —— سب کو افسوس تھا کہ اتنا اچھا مکینک تباہ ہو رہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بہت اچھا مکینک تھا۔ مجھے کوئی بھی بگڑی مشین دے دی جاتی، اس کو سرسری طور پر دیکھنے کے بعد میں یوں چٹکیوں میں ٹھیک کر دیتا —— جہاں تک میں سمجھتا ہوں، میری یہ ذہانت صرف شراب ملنے کی امید پر قائم تھی، اس لیے کہ میں پہلے طے کر لیا کرتا تھا کہ اگر کام ٹھیک ہو گیا تو وہ مجھے اتنے روپے ادا کر دیں گے، جن میں سے میری دو چار روز کی شراب چل سکے گی۔

وہ لوگ خوش تھے۔ مجھے وہ تین چار روز کی شراب کے دام ادا کر دیتے۔ اس لیے کہ جو کام میں نے کیا تھا، وہ کسی اور سے نہیں ہو سکتا تھا۔

لوگ مجھے لُوٹ رہے تھے۔ میری ذہانت و ذکاوت پر میری اجازت سے ڈاکے ڈال رہے تھے —— اور لطف یہ ہے کہ میں سمجھتا تھا، میں انھیں لُوٹ رہا ہوں، اُن کی جیبوں پر ہاتھ صاف کر رہا ہوں —— اصل میں مجھے اپنی صلاحیتوں کی کوئی قدر نہ تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ میکنزم بالکل ایسی ہے، جیسے کھانا کھانا یا شراب پینا۔

میں نے جب بھی کوئی کام ہاتھ میں لیا، مجھے کوفت محسوس نہیں ہوئی۔ البتہ اتنی بات ضرور تھی کہ جب شام کے چھ بجنے لگتے تو میری طبیعت بے چین ہو جاتی۔ کام مکمل ہو چکا ہوتا، مگر میں ایک دو پیچ غائب کر دیتا تاکہ دوسرے روز بھی آمدن کا سلسلہ قائم رہے —— یہ شراب حرامزادی کتنی بُری چیز ہے کہ آدمی کو بے ایمان بھی بنا دیتی ہے۔

میں قریب قریب ہر روز کام کرتا تھا۔ میری مانگ بہت زیادہ تھی، اس لیے کہ مجھ ایسا کاریگر ملک بھر میں نایاب تھا —— "تار باجا اور راگ بوجھا" والا حساب تھا۔ میں مشین دیکھتے ہی سمجھ جاتا تھا کہ اس میں کیا قصور ہے۔

میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں، مشینری کتنی بھی بگڑی ہوئی کیوں نہ ہو، اُس کو ٹھیک کرنے میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگنا چاہیے، لیکن اگر اُس میں نئے پرزوں کی ضرورت ہو اور وہ آسانی سے دستیاب نہ ہو رہے ہوں تو اُس کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

میں بلاناغہ شراب پیتا تھا اور سوتے وقت بلاناغہ اپنے قرض کے متعلق سوچتا تھا، جو مجھے مختلف آدمیوں کو ادا کرنا تھا۔ یہ ایک بہت ہی بڑا عذاب تھا۔ پینے کے باوجود، اضطراب کے باعث مجھے نیند نہ آتی ——

دماغ میں سینکڑوں اسکیمیں آتی تھیں۔ بس میری خواہش تھی کہ کہیں سے دس ہزار روپیہ آجائے تو میری جان میں جان آئے۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ قرض کا فی الفور ادا کر دوں۔ ایک ٹیکسی لُوں اور ہر قرض خواہ کے پاس جاکر معذرت طلب کروں اور جیب سے روپیہ نکال کر اُن کو دے دوں جو روپے باقی بچیں، اُن سے ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر خرید لوں اور شراب پینا چھوڑ دوں۔ پھر یہ خیال آتا کہ نہیں، دس ہزار سے کام نہیں چلے گا، کم از کم پچاس ہزار ہونے چاہئیں ——— میں سوچنے لگتا کہ اگر اتنے روپے آجائیں، جو یقیناً آنے چاہئیں، تو سب سے پہلے ایک ہزار نادار لوگوں میں تقسیم کروں گا، ایسے لوگوں میں جو روپیہ لے کر کچھ کاروبار کر سکیں۔

باقی رہے اُنچاس ہزار ——— اس رقم میں سے میں نے دس ہزار اپنی بیوی کو دینے کا ارادہ کیا۔ میں نے سوچا کہ فیکسڈ ڈپوزٹ ہونا چاہیے ——— تو گیارہ ہزار ہوئے، اور باقی رہے اُنتالیس ہزار، جو میرے لیے بہت کافی تھے ——— میں نے سوچا، یہ میری زیادتی ہے۔ چنانچہ میں نے بیوی کا حصّہ دوگنا کر دیا یعنی بیس ہزار ——— اب بچے اُنتیس ہزار ——— میں نے سوچا کہ پندرہ ہزار اپنی بیوہ بہن کو دے دوں۔ اب میرے پاس چودہ ہزار رہے۔ ان میں سے آپ سمجھیے کہ تقریباً دو ہزار قرض کے نکل گئے اور باقی بچے بارہ ہزار ——— ایک ہزار روپے کی اچھی شراب آنی چاہیے، لیکن میں نے فوراً تھو کر دیا اور یہ سوچا کہ پہاڑ پر چلا جاؤں گا اور وہاں کم از کم چھ مہینے رہوں گا، تاکہ صحت درست ہو جائے ——— شراب کے بجائے دودھ پیا کروں گا۔

بس ایسے ہی خیالات میں دن رات گذر رہے تھے ——— پچاس ہزار کہاں سے آئیں گے، یہ مجھے معلوم نہیں تھا ——— ویسے دو تین اسکیمیں ذہن میں تھیں؛ "شمع" دہلی کے معمّے حل کروں اور پہلا انعام حاصل کر لوں، ڈربی کی لاٹری کا ٹکٹ خرید لوں، یا چوری کروں اور بڑی صفائی سے۔

میں فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے کون سا قدم اٹھانا چاہیے ——— بہرحال یہ طے تھا کہ مجھے پچاس ہزار حاصل کرنا ہیں، یُوں ملیں یا ووں ملیں۔

اسکیمیں سوچ سوچ کر میرا دماغ چکرا گیا ——— رات کو نیند نہیں آتی تھی، جو بہت بڑا عذاب تھا۔ قرض خواہ بے چارے تقاضے نہیں کرتے تھے، لیکن جب میں اُن کی شکل دیکھتا تھا تو ندامت کے مارے پسینہ پسینہ ہو جاتا۔ بعض اوقات تو میرا سانس رکنے لگتا اور میرا جی چاہتا کہ خودکشی کر لُوں اور اس عذاب سے نجات پاؤں۔

مجھے معلوم نہیں، کیسے اور کب میں نے تہیہ کر لیا کہ چوری کروں گا ——— مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ مجھے کیسے معلوم ہوا کہ محلّے میں ایک بیوہ عورت رہتی ہے، جس کے پاس بے اندازہ دولت ہے، اور وہ اکیلی رہتی ہے۔

میں وہاں رات کے دو بجے پہنچا۔ یہ مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ دوسری منزل پر رہتی ہے ——— نیچے پٹھان کا پہرہ تھا ——— میں نے سوچا، کوئی اور ترکیب سوچنی چاہیے اوپر جانے کے لیے ——— میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے خود کو اُس پارسی بیوہ کے فلیٹ کے اندر پایا ——— میرا خیال ہے کہ میں پائپ

کے ذریعے سے اوپر چڑھ گیا تھا ـــــ ٹارچ میرے پاس تھی۔ اُس کی روشنی میں مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک بہت بڑا سیف تھا ـــــ مَیں نے اپنی زندگی میں کبھی سیف کھولا تھا نہ بند کیا تھا، لیکن اُس وقت جانے مجھے کہاں سے ہدایت ملی کہ مَیں نے ایک معمولی تار سے اُسے کھول ڈالا۔ اندر زیور ہی زیور تھے، بہت بیش قیمت ـــــ مَیں نے سب سمیٹے اور مکّے مدینے والے زرد رومال میں باندھ لیے ـــــ کوئی پچاس ساٹھ ہزار روپے کا مال ہوگا ـــــ مَیں نے کہا، ٹھیک ہے، بس اتنا ہی چاہیے تھا ـــــ کہ اچانک دوسرے کمرے سے ایک بڑھیا پارسی عورت نمودار ہوئی۔ اس کا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا ـــــ مجھے دیکھ کر پوپلی سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی ـــــ مَیں بہت حیران ہوا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ مَیں نے اپنی جیب سے بھرا ہوا پستول تان دیا۔

اُس کی پوپلی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر اور زیادہ پھیل گئی ـــــ اُس نے مجھ سے بڑے پیار سے پوچھا: "آپ یہاں کیسے آئے؟"

مَیں نے سیدھا سا جواب دیا: "چوری کرنے۔"

"اوہ!"

بڑھیا کے چہرے کی جھریاں مسکرانے لگیں: "تو بیٹھو۔۔۔ میرے گھر میں نقدی کی صورت میں صرف ڈیڑھ روپیہ ہے۔۔۔ تم نے زیور چرایا ہے، لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم پکڑے جاؤ گے، کیونکہ ان زیوروں کو کوئی بڑا جوہری ہی لے سکتا ہے اور ہر بڑا جوہری انھیں پہچانتا ہے۔۔۔" یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

مَیں بہت پریشان ہوا کہ یا الٰہی یہ سلسلہ کیا ہے، مَیں نے چوری کی ہے اور بڑی بی مسکرا مسکرا کر مجھ سے باتیں کر رہی ہیں، کیوں؟

لیکن فوراً اس "کیوں" کا مطلب سمجھ میں آگیا جب بڑی بی نے آگے بڑھ کر میرے پستول کی پروا نہ کرتے ہوئے، میرے ہونٹوں کا بوسہ لے لیا اور اپنی باہیں میری گردن میں ڈال دیں ـــــ اس وقت، خدا کی قسم، میرا دل چاہا کہ زیوروں کی گٹھڑی ایک طرف پھینک دوں اور وہاں سے بھاگ جاؤں۔ مگر وہ تسمہ پا عورت تھی۔ اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ مَیں مطلقاً ہل جل نہ سکا ـــــ اصل میں میرے بزرگ والدین میں ایک عجیب و غریب قسم کا خوف سرایت کر گیا تھا۔ مَیں اُسے ڈائن سمجھنے لگا تھا، جو میرا کلیجہ نکال کر کھانا چاہتی تھی۔

میری زندگی میں کسی عورت کا دخل نہیں تھا۔ مَیں غیر شادی شدہ تھا۔ مَیں نے اپنی زندگی کے تیس برسوں میں کسی عورت کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ مگر پہلی رات جب کہ مَیں چوری کرنے کے لیے نکلا تو مجھے وہ پچاسی برس کی بڑھیا مل گئی، جس نے مجھ سے عشق کرنا شروع کر دیا ـــــ آپ کی جان کی قسم، میرے ہوش و حواس غائب ہو گئے۔ وہ بہت ہی کریہہ المنظر تھی ـــــ مَیں نے اس سے ہاتھ جوڑ کر کہا: "بڑی بی، مجھے بخش دیجیے۔۔۔ یہ پڑے ہیں آپ کے زیور۔۔۔ مجھے اجازت دیجیے۔"

اُس نے تحکمانہ لہجے میں کہا: "تم نہیں جا سکتے۔۔۔ تمھارا پستول میرے پاس ہے۔۔۔ اگر تم نے ذرا سی

جنبش بھی کی تو میں ذبح کر دوں گی، یا ٹیلی فون کر کے پولیس کو اطلاع دے دوں گی کہ وہ آ کر تمھیں گرفتار کر لیں۔ ۔ ۔ لیکن جانِ من، مَیں ایسا نہیں کروں گی۔ ۔ ۔ مجھے تم سے محبّت ہو گئی ہے۔ ۔ ۔ بس سمجھ لو، میں ابھی تک کنواری ہوں۔ ۔ ۔ میرا خیال ہے کہ شاید میں اس عمر تک صرف تمھارے لیے کنواری رہی ہوں۔ ۔ ۔ اب تم یہاں سے نہیں جا سکتے۔"

یہ سُن کر میں، قریب تھا کہ بیہوش ہو جاتا، ٹن ٹن شروع ہو گئی ——— دُور کوئی کلاک صبح کے پانچ بجنے کی اطلاع دے رہا تھا ——— میں نے بڑی بی کی ٹھوڑی پکڑی اور اس کے مُرجھائے ہوئے ہونٹوں کا بوسہ لے کر جھوٹ بولتے ہوئے کہا: "میں نے اپنی زندگی میں سینکڑوں عورتیں دیکھی ہیں لیکن خدا واحد شاہد ہے کہ تم ایسی عورت سے میرا کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ ۔ ۔ تم کسی جوہر کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہو۔ ۔ ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنی زندگی کی پہلی چوری تمھارے مکان سے شروع کی۔ ۔ ۔ یہ زیور پڑے ہیں۔ ۔ ۔ میں کل آؤں گا، بشرطیکہ تم وعدہ کرو کہ مکان میں اور کوئی نہ ہو گا۔"

بڑھیا یہ سُن کر بہت خوش ہوئی: "ضرور آنا۔ ۔ ۔ تم جیسا چاہتے ہو، ویسا ہی ہو گا۔ ۔ ۔ گھر میں ایک مچھر تک بھی نہیں ہو گا، جو تمھارے کانوں کو تکلیف دے۔ ۔ ۔ مجھے افسوس ہے کہ گھر میں صرف ایک روپیہ آٹھ آنے ہیں۔ ۔ ۔ تم کل آنا۔ ۔ ۔ میں تمھارے لیے بیس پچیس ہزار روپے بینک سے نکلوا رکھوں گی۔ ۔ ۔ یہ لو اپنا پستول۔"

میں نے اپنا پستول لیا اور وہاں سے دُم دبا کر بھاگا۔

پہلا وار خالی گیا تھا ——— میں نے سوچا، کہیں اور کوشش کرنی چاہیے ——— قرض ادا کرنے کے سلسلے میں جو پلان میں نے بنایا تھا، اُس کی تکمیل بھی ہونی چاہیے۔

چنانچہ میں نے ایک جگہ اور کوشش کی ——— سردیوں کے دن تھے۔ صبح کے چھ بجنے والے تھے۔ یہ ایسا وقت ہوتا ہے، جب سب گہری نیند سو رہے ہوتے ہیں ——— مجھے ایک مکان کا پتہ تھا کہ اُس کا جو مالک ہے، بڑا مالدار ہے، بہت کنجوس ہے، اپنا روپیہ بینک میں نہیں رکھتا، گھر میں رکھتا ہے ——— میں نے سوچا، اُس کے ہاں چلنا چاہیے۔

میں وہاں پہنچ گیا۔ کن مشکلوں سے اندر داخل ہوا، بیان نہیں کر سکتا۔ بہرحال پہنچ گیا۔

صاحبِ خانہ، جو ماشاء اللہ جوان تھے، سو رہے تھے ——— میں نے اُن کے سرہانے سے چابیاں نکالیں اور الماریاں کھولنا شروع کر دیں۔

ایک الماری میں کاغذات تھے اور کچھ فرینچ لیدر۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ شخص، جو کنوارا ہے، فرینچ لیدر کہاں استعمال کرتا ہے ——— دوسری الماری میں کپڑے تھے۔ تیسری بالکل خالی تھی، معلوم نہیں، اُس میں تالا کیوں پڑا تھا۔

اور کوئی الماری نہیں تھی۔ میں نے تمام مکان کی تلاشی لی، لیکن مجھے ایک پیسہ بھی نظر نہ آیا ——— میں نے سوچا اس شخص نے ضرور اپنی دولت کہیں دبا کر رکھی ہو گی، چنانچہ میں نے اس کے سینے پر بھرا ہوا پستول رکھ کر اسے

جگایا۔

وہ ایسا چونکا اور بدکا کہ میرا پستول فرش پر جا پڑا۔

میں نے ایک دم پستول اٹھایا اور اس سے کہا: "میں چور ہوں اور یہاں چوری کرنے آیا ہوں۔۔۔ تمھاری تین الماریوں سے مجھے ایک دمڑی بھی نہیں ملی ہے، حالانکہ میں نے سُنا تھا کہ تم بڑے مالدار آدمی ہو۔"

وہ شخص جس کا نام مجھے اب یاد نہیں، مسکرایا۔ وہ انگڑائی لے کر اُٹھا اور مجھ سے کہنے لگا: "یار تم چور ہو تو تم نے مجھے پہلے اطلاع دی ہوتی۔۔۔ مجھے چوروں سے بہت پیار ہے۔۔۔ یہاں جو بھی آتا ہے، وہ خود کو بڑا شریف آدمی کہتا ہے، حالانکہ وہ اوّل درجے کا کالا چور ہوتا ہے۔۔۔ تم چور ہو، اور تم نے اپنے آپ کو چھپایا نہیں ہے۔۔۔ میں تم سے مِل کر بہت خوش ہوا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد اُس نے ریفری جی ریٹر کھولا ـــــ میں سمجھا کہ شاید وہ میری تواضع شربت وغیرہ سے کرے گا، لیکن اُس نے مجھے بُلایا اور کُھلے ہوئے ریفری جی ریٹر کے پاس لے جاکر کہا: "دوست، میں اپنا سارا روپیہ اِس میں رکھتا ہوں۔۔۔ یہ صندوقچی دیکھتے ہو۔۔۔ اس میں قریب قریب ایک لاکھ روپیہ پڑا ہے۔۔۔ تمھیں کتنا چاہیے؟"

اُس نے صندوقچی باہر نکالی، جو یخ بستہ تھی۔ اُسے کھولا۔ اندر سبز رنگ کے نوٹوں کی گڈیاں پڑی تھیں ـــــ ایک گڈی نکال کر اُس نے میرے ہاتھ میں تھما دی اور کہا: "بس اتنے کافی ہوں گے۔۔۔ دس ہزار ہیں۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ اُسے کیا جواب دوں ـــــ میں تو چوری کرنے آیا تھا ـــــ میں نے گڈی اُس کو واپس دی اور کہا: "صاحب، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔۔۔ مجھے معافی دیجیے۔۔۔ پھر کبھی حاضر ہوں گا۔"

میں وہاں سے، آپ سمجھیے کہ دُم دبا کر بھاگا ـــــ گھر پہنچا تو سورج نکل چکا تھا۔

میں نے سوچا کہ چوری کا ارادہ ترک کر دینا چاہیے ـــــ دو جگہ کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہوا ـــــ اگلی رات کوشش کی جا سکتی تھی، مگر کامیابی یقینی نہیں تھی ـــــ اور قرض بدستور اپنی جگہ موجود تھا، جو مجھے بہت تنگ کر رہا تھا ـــــ حلق میں، یوں سمجھیے۔ ایک پھانس سی اٹک گئی تھی۔

میں نے بالآخر یہ ارادہ کر لیا کہ جب اچھی طرح سو چکوں گا تو اُٹھ کر خودکشی کر لوں گا۔

میں سو رہا تھا کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔

میں اٹھا ـــــ دروازہ کھولا ـــــ ایک بزرگ کھڑے تھے ـــــ میں نے اُن کو آداب عرض کیا۔

انھوں نے مجھ سے فرمایا: "یہ لفافہ دینا تھا، اس لیے آپ کو تکلیف دی۔۔۔ معاف فرمائیے گا، آپ سو رہے تھے، اور میں نے آپ کو جگا دیا۔"

میں نے اُن سے لفافہ لے لیا ـــــ وہ سلام کر کے چلے گئے۔

میں نے دروازہ بند کیا ـــــ لفافہ کافی وزنی تھا ـــــ میں نے اُسے کھولا اور دیکھا کہ سو سو روپے

کے بے شمار نوٹ ہیں۔ گنے تو پچاس ہزار ہو گئے ـــــ ایک مختصر سا رقعہ تھا، جس میں لکھا تھا کہ آپ کے روپے مجھے بہت دیر سے ادا کرنے تھے، افسوس ہے کہ میں اب ادا کرنے کے قابل ہوا ہوں۔

میں نے بہت غور کیا کہ وہ صاحب کون ہو سکتے ہیں، جنھوں نے مجھ سے قرض لیا تھا ـــــ سوچتے سوچتے میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے، کسی نے مجھ سے قرض لیا ہو، جو مجھے یاد نہ رہا ہو۔

لفافہ تکیے کے نیچے رکھ کر میں نے سارا حساب کر لیا: بیس ہزار اپنی بیوی کو، پندرہ ہزار روپے اپنی بیوہ بہن کو ـــــ دو ہزار قرض کے ـــــ باقی بچے بارہ ہزار، اس لیے کہ ایک ہزار میں نے اچھی شراب کے کھاتے میں رکھ لیے تھے ـــــ پہاڑ پر جانے اور دودھ پینے کا خیال میں نے چھوڑ دیا۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی ـــــ اٹھ کر باہر گیا۔ دروازہ کھولا ـــــ میرا ایک قرض خواہ کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے پانچ سو روپے لینا تھے ـــــ میں لپک کر اندر گیا ـــــ تکیے کے نیچے نوٹوں کا لفافہ دیکھا، مگر وہاں کچھ موجود نہ تھا۔

تین موٹی عورتیں

ایک کا نام مسز ریچ مین اور دوسری کا مسز سٹلف تھا۔ ایک بیوہ تھی، تو دوسری دو شوہروں کو طلاق دے چکی تھی۔ تیسری کا نام مس ہکسبین تھا۔ وہ ابھی تک ناکتخدا تھی ـــــ ان تینوں کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی اور ان کی زندگی کے دن مزے سے کٹ رہے تھے۔

مسز سٹلف کے خدو خال موٹاپے کی وجہ سے بھدے پڑ گئے تھے۔ اس کی باہیں، کندھے اور کولھے بھاری معلوم دیتے تھے، لیکن اس ادھیڑ عمر میں بھی وہ بن سنور کر رہتی تھی۔ وہ نیلا لباس صرف اِس لیے پہنتی تھی کہ اس کی آنکھوں کی چمک نمایاں ہو، اور بناوٹی طریقوں سے اس نے اپنے بالوں کی خوبصورتی بھی قائم کر رکھی تھی ـــــ اسے مسز ریچ مین اور ہکسبین اِس لیے پسند تھی کہ وہ دونوں اس کی نسبت موٹی تھیں، اور چونکہ وہ عمر میں بھی اُن دونوں سے قدرے چھوٹی تھی، وہ اُسے اپنی بچی کی طرح خیال کرتیں ـــــ یہ کوئی ناپسند بات نہ تھی۔ وہ دونوں خوش طبیعت تھیں اور اکثر تفریحاً اُس کے ہونے والے منگیتر کا ذکر چھیڑ دیتیں ـــــ وہ دونوں خود تو اس عشق و محبت کی الجھن سے کوسوں دُور تھیں، لیکن اِس معاملے میں انھیں مسز سٹلف سے پوری ہمدردی تھی ـــــ انھیں

یقین تھا کہ وہ کچھ دنوں ہی میں کوئی نیا گل کھلانے والی ہے۔

وہ مسز ستلف کے لیے کسی اچھے بر کی تلاش میں تھیں۔ کوئی پنشن یافتہ ایڈمرل، جو گاف بھی کھیلنا جانتا ہو، یا کوئی ایسا رنڈوا، جو گھر بار کے جھنجال سے آزاد ہو ـــــ بہرحال یہ ضروری تھا کہ اُس کی آمدن معقول ہو۔

مسز ستلف اُن کی باتیں بڑے غور سے سُنتی اور دل ہی دل میں ہنس دیتی ـــــ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک بار پھر شادی کا تجربہ کرنا چاہتی تھی، لیکن شوہر کے انتخاب میں اُس کا مذاق بالکل مختلف تھا۔ اُسے کسی سیاہ رنگ اور چھریرے بدن کے طاؤس کی چاہت تھی، جس کی آنکھیں حددرجہ چمکیلی ہوں یا کوئی ہسپانوی، جو اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہو اور اُس کی عمر کسی صورت میں تیس برس سے ایک دن بھی زیادہ نہ ہو۔

یہ سچ ہے کہ تینوں ایک دوسری پر جان دیتی تھیں ـــــ اُن کی آپس میں محبت کی وجہ صرف موٹاپا تھا، اور متواتر اکٹھے برج کھیلنے سے ان کی دوستی اور گہری ہو گئی۔

ان کی پہلی ملاقات کرلسباد میں ہوئی، جہاں وہ ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرتی تھیں اور ایک ہی ڈاکٹر کے زیر علاج تھیں۔

مسز رچ مین خوش شکل بھی تھی ـــــ اس کی نشیلی آنکھیں، بھرے بھرے گال اور رنگین ہونٹ بہت ہی دلفریب اور دلکش تھے ـــــ اسے ہر وقت کھانے پینے کی فکر رہتی۔ مکھن، بالائی، آلو اور چربی ملی پڈنگ اس کا من بھاتا کھاجا تھا۔ وہ سال میں گیارہ مہینے تو جی بھر کے کھاتی، پھر علاج کے ذریعے دُبلی ہونے کے لیے ایک مہینہ کرلسباد چلی جاتی ـــــ وہ دن بدن پھولتی جا رہی تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اگر اُسے من مرضی کی خوراک کھانے کو نہ ملے تو زندگی بیکار ہے۔ مگر اُس کے ڈاکٹر کو اس بات سے اتفاق نہ تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ڈاکٹر کچھ ایسا قابل نہیں، ورنہ کیا عجب تھا کہ وہ ذرا دُبلی ہو جاتی۔

مسز رچ مین نے مس ہکسبین سے اس بات کا ذکر کیا تو وہ بس ایک قہقہہ لگا کر خاموش ہو گئی۔

مس ہکسبین کی آواز بہت گہری تھی اور چہرہ چپٹا سا تھا۔ اُس کی دونوں آنکھوں میں بلی کی آنکھوں ایسی چمک دمک تھی۔ اُسے مردانہ پوشاک زیادہ پسند تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ صرف مس ہکسبین کی خوش مزاجی کی وجہ سے تینوں سہیلیاں ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئی تھیں ـــــ وہ تینوں ایک ہی وقت پر کھانا کھاتیں، اکٹھی سیر کو جاتیں اور ٹینس کھیلنے کے وقت بھی ایک دوسری سے کبھی جُدا نہ ہوتیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب وہ اپنا وزن کرتیں تو اپنے موٹاپے میں کوئی فرق نہ پا کر اداس سی ہو جاتیں۔

مس ہکسبین کو یہ بات بہت ہی ناگوار گزری کہ مسز رچ مین طبی علاج سے اپنا وزن بیس پاؤنڈ گھٹا کر، بدپرہیزی کی وجہ سے کچھ ہی دنوں میں پھر اُسی طرح موٹی ہو جائے ـــــ اُس کے کہنے پر تینوں کرلسباد چھوڑ کر چند ہفتوں کے لیے کہیں اور چلی گئیں۔

مسز برج مین کمزور طبیعت کی تھی۔ اُسے ایک ایسے انسان کی ضرورت تھی، جو اُسے بد اعتدالی سے بچا سکے۔ اُسے یقین تھا کہ اب اُسے ورزش کرنے کا خوب موقعہ ملے گا، اور چربی ملی چیزیں کھانے سے بھی نجات مل جائے گی ــــــ اور کوئی وجہ نہیں کہ اُن سب کا وزن دنوں میں کم ہو جائے۔

مسز ستلف اپنے دل میں انوکھے ارادے باندھ رہی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ وہاں دنوں میں اس کا رنگ نکھر جائے گا، اور وہ اپنے لیے کوئی چھیلا بانکا اطالوی، فرانسیسی یا انگریز تلاش کرے گی۔

وہ تینوں ہفتے میں صرف دو دن اُبلے ہوئے انڈے اور ٹماٹر کھاتیں اور ہر صبح اُٹھ کر اپنا وزن کرتیں۔

مسز ستلف کا وزن اب صرف ایک سو چوّن پاؤنڈ رہ گیا اور وہ تو گویا اپنے آپ کو ایک جواں سال لڑکی سمجھنے لگی ــــــ مس ہکبین اور مسز برج مین کے موٹاپے میں بھی کافی فرق پڑ گیا۔

وہ تینوں مطمئن نظر آتی تھیں، لیکن برج کھیلنے کے لیے ایک چوتھے کھلاڑی کی ضرورت نے انھیں ایک حد تک پریشان سا کر دیا تھا۔

وہ صبح سویرے ڈھیلے ڈھالے پاجامے پہنے، چبوترے پر بیٹھی، دودھ اور کھانڈ ملائے بغیر چائے پی رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ڈاکٹر ہڈ برٹ کے تیار کیے ہوئے بسکٹ بھی کھا رہی تھیں، جن کے متعلق یہ گارنٹی دی گئی تھی کہ وہ چربی سے بالکل پاک ہیں ــــــ ناشتے کے وقت مس ہکبین نے اتفاقاً لینا کا ذکر کیا۔

"وہ کون ہے ؟" مسز ستلف نے پوچھا۔

"وہ میرے اُس چچیرے بھائی کی بیوی ہے، جس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے . . . وہ گذشتہ دنوں اعصاب شکنی کا شکار رہی . . . کیوں نہ اُسے دو چار ہفتوں کے لیے یہاں بُلا لیں۔"

"کیا وہ برج کھیلنا جانتی ہے ؟"

"کیوں نہیں . . . اُس کے یہاں آجانے سے کسی دوسرے کی ضرورت بھی نہ رہے گی۔"

بات طے ہو گئی ــــــ لینا کو بُلانے کے لیے تار بھیجا گیا اور وہ تیسرے دن آ پہنچی۔

مس ہکبین اُسے اسٹیشن پر لینے گئی شوہر کی موت کی وجہ سے لینا کے چہرے پر غم کے آثار نمایاں تھے ــــــ مس ہکبین نے اُسے دو سال سے نہیں دیکھا تھا، اس لیے اُس نے بڑی گرم جوشی سے لینا کا منہ چوم لیا۔

"تم بہت دُبلی ہو۔" مس ہکبین نے کہا۔

لینا مسکرا دی۔ "گزشتہ دنوں میری طبیعت علیل رہی، اور اب تو وزن بھی بہت کم ہو گیا ہے۔"

مس ہکبین نے ایک سرد آہ بھری، لیکن یہ ظاہر نہ ہو سکا کہ اس کی وجہ رشک تھی یا لینا سے ہمدردی۔

وہ اُسے ایک پُر فضا ہوٹل میں لے گئی، جہاں دونوں سہیلیوں سے اُس کا تعارف کرایا گیا ــــــ لینا کی بے کسی دیکھ کر مسز برج مین کا دل بھر آیا، اور لینا کے چہرے کی زردی نے مسز ستلف کو بھی بہت متاثر کیا۔

ہوٹل میں تھوڑی دیر تفریح کے بعد وہ لنچ کے لیے اپنی قیام گاہ کو چل دیں۔

"مجھے کچھ روٹی چاہیے۔" لینا کے یہ الفاظ تینوں سہیلیوں کے کانوں پر بہت گراں گزرے ——— وہ تو کب سے روٹی چھوڑ چکی تھیں، اور تو اور مسز رچ مین ایسی لالچی عورت بھی روٹی سے پرہیز کرتی تھی۔"

مس ہکبین نے از راہِ مہمان نوازی خانساماں سے کہا کہ وہ فوراً لینا کے حکم کی تعمیل کرے۔

"تھوڑا مکھن بھی۔"

کسی غیر مرئی قوت نے ایک لمحے کے لیے اُن سب کے ہونٹ سی دیے۔

"غالباً گھر میں مکھن موجود نہیں۔ ۔ ۔ ابھی خانساماں سے پوچھتی ہوں۔" مس ہکبین نے کسی قدر توقف سے جواب دیا۔

"مجھے مکھن روٹی بہت پسند ہے۔" لینا نے مسز رچ مین سے مخاطب ہو کر کہا، اور خانساماں سے مکھن لے کر بڑے اطمینان سے روٹی پر لگایا۔

مس ہکبین بولی: "ہم یہاں بہت سادہ غذا کھاتے ہیں۔ ۔ ۔ تمھیں غالباً کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"نہیں تو۔ ۔ ۔ میں بھی سادہ غذا کی عادی ہوں۔ ۔ ۔" لینا نے روٹی کے ٹکڑے پر مکھن لگاتے ہوئے کہا، "مجھے جب تک مکھن، روٹی اور بالائی ملتی رہے، میں بہت مطمئن رہتی ہوں۔"

"افسوس کہ یہاں کہیں بالائی نہیں ملتی۔" مسز رچ مین نے کہا۔

"اوہ۔ ۔ ۔" لینا بولی۔

پھر لنچ پر بغیر چربی کے کباب بھیجے گئے۔ اس کے علاوہ پالک تھی اور دم پخت ناشپاتیاں۔

ناشپاتی کھاتے ہی لینا نے متجسس نظروں سے خانساماں کی طرف دیکھا اور اشارہ پاتے ہی خانساماں کھانڈ لے کر حاضر ہو گیا ——— لینا نے اپنی قہوہ کی پیالی میں تین چمچے کھانڈ ڈال دی۔

"تمھیں کھانڈ بہت پسند ہے؟" مسز سٹلف نے پوچھا۔

"ہاں۔" لینا نے جواب دیا۔

"ہمیں تو سکرین زیادہ مرغوب ہے۔" مس ہکبین نے ایک ٹکیہ اپنی پیالی میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ تو ایک بے لذت شے ہے۔" لینا بولی۔

مسز رچ مین منہ بنا کر اور للچائی ہوئی نظروں سے کھانڈ کی طرف دیکھنے لگی ——— مس ہکبین نے اُسے زور سے پکارا تو ایک سرد آہ بھر کر اس نے بھی بجائے اسکرین کی ٹکیہ اٹھالی۔

لنچ سے فارغ ہونے کے بعد وہ برج کھیلنے بیٹھ گئیں ——— لینا خوب کھیلی۔ سب نے کھیل کا لطف اٹھایا۔ مسز سٹلف اور مسز رچ مین کے دل میں معزز مہمان کے لیے گہری ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا ——— مس ہکبین کے دل کی مراد بھی بر آئی، اور وہ یہی تو چاہتی تھی کہ لینا ان کے ساتھ دو چار ہفتے خوشی سے بسر کر سکے۔

چند ساعت بعد مس ہکیبین اور مسز ریچ مین گاف کھیلنے چلی گئیں اور مسز سلف ایک جواں سال، خوش شکل پرنس روکا بیر کے ساتھ سیر کو نکل گئی ــــ لینا کچھ دیر سستانے کے خیال سے لیٹ گئی۔

ڈنر سے تھوڑا وقت پہلے سب لوٹ آئیں ــــ یہ اُن کا روز کا معمول تھا۔

"لینا پیاری، کہو وقت کیسے گزرا۔ ۔" ایک دم مس ہکیبین نے کہا: "گاف کھیلتے وقت دھیان تمہاری ہی طرف تھا۔"

"اوہ، پہلے تو میں بڑے مزے سے بستر پر ہی پڑی رہی، پھر میں نے باہر جا کر کاک ٹیل پی۔ ۔ ۔ اور سنو، ایک چھوٹا سا قہوہ خانہ میری نظر پڑا، جہاں بڑی اچھی بالائی ملتی ہے۔ ۔ ۔ میں نے روزانہ مکان پر بالائی منگوانے کا انتظام کر لیا ہے۔" لینا کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور اُسے یقین تھا کہ وہ تینوں اُس کی بات کو سراہیں گی۔

"تم کتنی اچھی ہو لینا۔ ۔" مس ہکیبین نے کہا: "لیکن افسوس کہ ہمیں بالائی پسند نہیں۔ ۔ ۔ ایسی آب و ہوا میں یہ ہمیں راس نہیں آسکتی۔"

"نہ سہی، پر میں جو سلامت ہوں،" لینا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمھیں کیا اپنی شکل وصورت کی کوئی پرواہ نہیں؟" مسز سلف نے مُنہ بنا کر کہا۔

"مجھے تو ڈاکٹر نے بالائی کھانے کو کہا ہے۔"

"کیا اُس نے مکھن، روٹی، آلو اور بالائی، چاروں ہی چیزیں تجویز کی ہیں؟"

"بے شک، سادہ غذا سے میں بھی مراد لیتی ہوں۔"

"تم یقیناً بہت موٹی ہو جاؤ گی۔"

لینا کھلکھلا کر ہنس دی۔

رات کو لینا کے سوجانے پر دیر تک تینوں نکتہ چینی کرتی رہیں ــــ اُس شام اُن کی طبیعت تنی شگفتہ تھی، اور اب مسز ریچ مین بیزار سی نظر آنے لگی۔ مسز سلف الگ جلی بیٹھی تھی اور مس ہکیبین کا مزاج بھی برہم ہو چکا تھا۔

"میں یہ قطعاً برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ میرا مَن بھاتا کھاجا میری آنکھوں کے سامنے بیٹھ کر اُڑائے۔" مسز ریچ مین نے ذرا تلخی سے جواب دیا۔

"یہ تو کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔" مس ہکیبین نے جواب دیا۔

"آخر تم نے اُسے یہاں بُلایا ہی کیوں؟"

"مجھے اِس بات کی کیا خبر تھی؟"

"اگر اُس کے دِل میں اپنے مرحوم شوہر کا ذرا بھی خیال ہوتا تو وہ کبھی پیٹ بھر کر نہ کھاتی۔ ۔ ۔ اُسے فوت ہوئے ابھی دو ہی مہینے تو گزرے ہیں۔"

"سُنا وہ کیا کہہ رہی تھی۔ ۔ ۔ کہ اُسے ڈاکٹر نے مکھن، روٹی، آلو اور بالائی کھانے کو کہا ہے۔"
"اُسے تو پھر کسی سینے ٹوریم کا رُخ کرنا چاہیے۔"
"وہ مہمان ہے تو تمھاری۔ ۔ ۔ ہمارا تو اُس سے کوئی رشتہ نہیں۔ ۔ ۔ میں تو متواتر دو ہفتے تک اُس پیٹو کا تماشہ دیکھتی رہی ہوں۔"
"صرف کھانے پینے کو زندگی کا مقصد سمجھ لینا بیہودگی ہے۔"
"تم کیا لینا کی آڑ لے کر مجھے بیہودہ پکار رہی ہو؟" مس ہکسین نے پوچھا۔
"لینا تو ہمارے سوتے میں باورچی خانے میں گھس کر کھاتی پیتی ہی ہے، تم خود بھی تو یہی کچھ کرتی ہو۔ ۔"
مسز ستلف نے ذرا تیکھی آواز میں کہا: "اور میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔"
ان الفاظ نے مس ہکسین کے تن بدن میں ایک آگ سی لگا دی ـــــ وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی: "مسز ستلف، اپنی زبان سنبھالو۔ ۔ تم کیا مجھے اتنا ہی کمینہ خیال کرتی ہو"
"تو آخر تمھارا وزن کیوں نہیں کم ہوتا؟"
"بالکل غلط۔ ۔ میرا تو سیروں وزن کم ہو گیا ہے" یہ کہہ کر مس ہکسین بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اور آنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ کر چھاتی پر گرنے لگے۔
"آپس میں بدگمانی سے فائدہ؟" مسز رچ مین نے ہولے سے کہا۔
مسز ستلف نے مس ہکسین کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا: "پیاری، تم میرا مطلب نہیں سمجھیں۔ ۔"
یہ کہہ کر وہ گھٹنوں کے بل جھکی اور اُس نے مس ہکسین کے جسم کو اپنی آغوش میں لینے کی کوشش کی۔ اُس کا دل بھر آیا، اور اُس کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی لڑی جاری ہو گئی۔
"تو کیا میں دُبلی دکھائی نہیں دیتی؟" مس ہکسین نے ہچکی لیتے ہوئے کہا۔
"ہاں بے شک۔ ۔" مسز ستلف نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔
مسز رچ مین بھی، جو فطرتاً نہایت کمزور طبیعت واقع ہوئی تھی، اب رونے لگی ـــــ یہ منظر بہت رقت خیز تھا ـــــ مس ہکسین ایسی عورت کو آنسو بہاتے دیکھ کر سنگ دل انسان بھی موم ہو جاتا ـــــ بالآخر انھوں نے اپنے آنسو پونچھے اور ہر ایک نے برانڈی اور پانی کے چند گھونٹ پیے۔
وہ اب اس بات پر متفق تھیں کہ لینا، ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق، اپنی من مرضی کی غذا کھائے۔ آخر وہ اُن کی مہمان ٹھہری۔ اُن کا فرض تھا کہ ہر طرح اُس کا کلیجہ ٹھنڈا کریں ـــــ انھوں نے ایک دوسری کا گرمجوشی سے مُنہ چوما اور اپنی اپنی خواب گاہوں میں چلی گئیں۔
یہ سچ ہے کہ انسانی فطرت بہت کمزور ہے اور اُس پر کسی کا کوئی اختیار نہیں ـــــ غذا کے معاملے میں اب ہر ایک اپنی مرضی کی آپ مالک تھی ـــــ انھوں نے مچھلی کے کباب شروع کیے تو لینا کی سویاں، مکھن

اور پنیر پر بسر ہونے لگی۔ وہ ہفتے میں دو بار اُبلے ہوئے انڈے اور کچے ٹماٹر کھاتیں، اور لینا مٹر کے دانے بالائی میں ملا کر کھاتی ـــــ لینا کو اب ٹماٹر کو مختلف مسالوں میں پکا کر کھانے کا شوق چرایا تھا، اور خانساماں تو باندا تھا ہی۔ وہ ہر بار ایک بہترین چیز تیار کر کے میز پر چُن دیتا۔

لینا نے ایک موقع پر یہ بھی کہا کہ ڈاکٹر نے اُسے لنچ پر برگنڈی کی ارغوانی شراب اور ڈنر پر شیمپین استعمال کرنے کو کہا ہے ـــــ اِن الفاظ نے تینوں سہیلیوں کو دم بخود کر دیا۔ وہ ابھی ابھی ہنس کھیل رہی تھیں، لیکن یکایک اُن کی کیفیت بدل گئی۔ مسز برج مین کا تو گویا رنگ زرد پڑ گیا۔ مسز ستلف کی نیلی آنکھوں میں ایک خوفناک سی چمک پیدا ہو گئی۔ اور مس ہکبین کی آواز بھرّا گئی۔

وہ جو برج کھیلتے وقت بڑے نرم لہجے میں ایک دوسرے سے بات کیا کرتی تھیں، اب بات بات پر بگڑنے لگیں ـــــ لینا نے اُنھیں بہتیرا سمجھایا بجھایا کہ کھیل کے وقت آپس میں تکرار مناسب نہیں، لیکن بے سُود ـــــ لینا ہمیشہ خوش رہتی کہ کھیل میں شروع ہی سے اُس کا پلّہ بھاری رہتا، دِنوں ہی میں اُس نے ایک بڑی رقم جیت لی تھی۔

تینوں موٹی سہیلیوں کو اب ایک دوسرے سے نفرت ہونے لگی۔ وہ اپنے مہمان سے بھی بدظن ہو چکی تھیں۔ وہ ایک دوسری کے خلاف ایک دوسری کے کان بھرتیں ـــــ جب لینا کی رخصت کا وقت آیا تو وہ بے شک ایک دوسری سے بہت دُور جا چکی تھیں۔ لینا کے سامنے وہ ایک دُوسری سے ظاہراً ملتی رہی تھیں، لیکن پھر یہ بات بھی نہ رہی تھی ـــــ وہ ایک دُوسری سے بہت مایوس ہو چکی تھیں۔

مس ہکبین جب لینا کو رخصت کرنے اسٹیشن پر گئی تو گاڑی پر سوار ہوتے وقت لینا نے کہا: "میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ تمھاری مہمان نوازی کا شکریہ ادا کر سکوں۔۔ "

"تمھاری صحبت بہت پُرلُطف رہی" مس ہکبین نے جواب دیا۔

جب گاڑی روانہ ہوئی تو مس ہکبین نے اِس زور سے آہ بھری کہ پلیٹ فارم اُس کے نیچے کانپ گیا ـــــ وہ "اُف، اُف" کا شور بلند کرتی گھر لوٹی۔

اُس نے غسل کا لباس پہنا اور ہوٹل کی طرف جا نکلی ـــــ اُس کی آنکھوں کے سامنے مسز برج مین نیا پائجامہ اور گلے میں موتیوں کی مالا پہنے، بناؤ سنگھار کیے بیٹھی تھی۔

وہ اُس کی طرف بڑھی: "کیا کر رہی ہو؟"

مسز برج مین کو مس ہکبین کے الفاظ دُور پہاڑوں میں بادل کی گرج کی طرح سُنائی دیے ـــــ اُس نے کہا: "کچھ کھا رہی ہُوں" اُس کے سامنے مکھن، سیب کا مربّہ، قہوہ اور بالائی وغیرہ چُنے ہوئے تھے۔ وہ گرم روٹی پر مکھن کی موٹی تہہ جما کر اُس پر بالائی رکھ رہی تھی۔

"تُم کھانے کے لالچ میں اپنی جان دے دو گی"

"کوئی پروا نہیں" مسز برج مین نے ایک بڑا لقمہ چباتے ہوئے کہا۔

"تم اور بھی موٹی ہو جاؤ گی۔"

"بس خاموش . . . اُس نابکار کو خدا سمجھے، جسے میں متواتر ہفتوں حلق میں رنگارنگ نوالے ٹھونستے دیکھتی رہی ہوں . . . ایک انسان تو اتنا ہضم نہیں کر سکتا۔"

مس ہکسین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بالکل بے جان سی ہوگئی۔ اُسے اُس وقت شاید ایک مضبوط مرد کی ضرورت تھی جو اُسے اپنے گھٹنوں پر لٹا کر پُچکارے۔ وہ خاموشی سے پاس ہی کی کُرسی پر بیٹھ گئی۔

خادم حاضر ہوا تو اُس نے قہوے کی ٹرے کی طرف اشارہ کر کے اُسے سب کچھ لانے کو کہا ـــــ جب وہ ہاتھ بڑھا کر کرمر رول اُٹھانے لگی تو مسز ریچ مین نے رکابی ایک طرف کھسکا دی ـــــ مس ہکسین جل بھُن گئی، اور اُس نے مسز ریچ مین کو ایک ایسے نام سے مخاطب کیا، جو خاص طور پر عورتوں کے شایانِ شان نہ تھا۔

اتنے میں خادم اُس کے لیے مکھن، مربّہ اور قہوہ لے کر آگیا۔

"نابکار، بالائی لانا بھول گیا،" وہ شیرنی کی طرح بپھر کر بولی۔

اُس نے کھانا شروع کیا اور حلق میں مکھن اور مربّہ ٹھونسنے لگی۔

ہوٹل میں اب رنگارنگ کے انسانوں کی چہل پہل نظر آنے لگی تھی ـــــ مسز سٹاف بھی پرنس روکامیر کے ساتھ چہل قدمی کرتی اُدھر آنکلی۔ وہ اپنے گرد ایک ریشمی لبادہ مضبوطی سے لپیٹے ہوئے تھی تاکہ اس طرح وہ کچھ دُبلی دکھائی دے۔ دُہری ٹھوڑی کا نقص چھپانے کے لیے اُس نے سر کو اوپر اُٹھایا ہوا تھا۔ وہ بہت مسرور تھی ـــــ ایک دوشیزہ کی طرح پرنس اُس سے اجازت لے کر پانچ منٹ کے لیے مردانہ ٹائلٹ میں اپنے بال سنوارنے چلا گیا۔ وہ بھی اپنے رخساروں کو غازہ سے چمکانے کے لیے زنانہ ٹائلٹ کی طرف بڑھی۔ یکایک اُس کی نظر اپنی دونوں سہیلیوں پر پڑی۔

وہ رُک گئی: "تم بیٹھو، حیوان . . ."

وہ کُرسی پر بیٹھ گئی اور اُس نے خادم کو پکارا ـــــ اُس کے ذہن سے اب پرنس کا خیال بھی اُتر چکا تھا۔

آنکھ جھپکتے میں خادم حاضر ہوگیا۔

اُس نے کہا: "میرے کھانے کو بھی یہیں لاؤ۔"

مس ہکسین بولی: "اور میرے لیے سویاں . . ."

"مس ہکسین!" مسز ریچ مین پکار اُٹھی۔

"بس خاموش . . ."

"میں بھی سویاں کھاؤں گی۔"

قہوہ لایا گیا اور کرمر رول اور بالائی بھی، مربّہ بھی، سویاں بھی ـــــ وہ گرم گرم روٹی پر ملائی کی تہہ جما کر کھانے لگیں، مربّے کے بڑے بڑے چمچے حلق میں ٹھونسنے لگیں ـــــ وہ گویا ایک خاص اہتمام سے کھا رہی تھیں ـــــ

ایسے موقع پر مسز سلف کے لیے پرنس روکا میرے لگاؤ ایک بے معنی بات تھی۔

"میں نے سالوں سے آلو نہیں کھائے۔" مس ہکسین نے دھیمی آواز میں کہا۔

مسز ریچ مین نے فوراً خادم کو تینوں کے لیے بھُنے ہوئے آلو لانے کو کہا۔

چند ہی لمحوں کے بعد بھُنے ہوئے آلو ان کے سامنے تھے ــــــ وہ بڑے چٹخارے لے کر کھانے لگیں۔

تینوں سہیلیوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا اور سرد آہیں بھرنے لگیں ــــــ اُن کے درمیان غلط فہمی آپ سے آپ دُور ہو گئی۔ اب اُن کے دلوں میں انتہائی محبّت کا جذبہ موجزن تھا ــــــ انھیں یقین نہ آیا کہ آج سے پہلے وہ ایک دوسری سے قطع تعلق پر آمادہ ہو چکی تھیں ــــــ آلو اب ختم ہو چکے تھے۔

"ہوٹل میں چاکلیٹ تو ضرور ہوں گے؟" مسز ریچ مین نے کہا۔

"کیوں نہیں؟"

تھوڑی دیر بعد مس ہکسین اپنا منہ کھولے حلق میں چاکلیٹ ٹھونس رہی تھی ـــــ مسز ریچ مین چاکلیٹ منہ میں ڈالنے سے پہلے، دونوں سہیلیوں کی طرف نظریں اُٹھائے، نا بکا رینا کو کوسنے لگی: "تم چاہے جو کہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ برج کھیلنا نہیں جانتی۔"

"بے شک۔" مسز سلف نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

مس ہکسین کا ذہن اُس وقت کسی لذیذ کیک کی فکر میں تھا۔

آرٹسٹ لوگ

جمیلہ کو پہلی بار محمود نے باغِ جناح میں دیکھا۔

وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ چہل قدمی کر رہی تھی ــــ سب نے کالے برقعے پہنے ہوئے تھے، مگر نقابیں اٹھی ہوئی تھیں۔

محمود سوچنے لگا: یہ کس قسم کا پردہ ہے کہ برقع اوڑھا ہوا ہے، مگر چہرہ ننگا ہے ۔۔۔ آخر اِس پردے کا مطلب کیا ہے ۔۔۔؟ ۔۔۔ مگر وہ جمیلہ کے حُسن سے بہت متاثر ہوا۔

وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی جا رہی تھی ــــ محمود اُس کے پیچھے چلنے لگا۔ اُس کو اِس بات کا قطعاً ہوش نہیں تھا کہ وہ ایک غیر اخلاقی حرکت کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اُس نے سینکڑوں مرتبہ جمیلہ کو گھور گھور کے دیکھا [illegible] علاوہ [illegible] دو بار اُس کو اپنی آنکھوں سے اشارے بھی کیے، مگر جمیلہ نے اُسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ اُس کی سہیلیاں بھی کافی خوب صورت تھیں، مگر محمود نے اُس میں ایک ایسی کشش پائی، جو لوہے کے [illegible] مقناطیس کو ہوتی ہے ــــ وہ اس کے ساتھ چمٹ کے رہ گیا تھا۔

ایک جگہ اُس نے جراُت سے کام لے کر جمیلہ سے کہا: "حضور اپنا نقاب تو سنبھالیے . . . ہوا میں اُڑ رہا ہے"
جمیلہ نے یہ سُن کر شور مچانا شروع کر دیا۔ اس پر پولیس کے دو سپاہی، جو اُس وقت باغ میں ڈیوٹی پر تھے۔ دوڑتے آئے اور اُنھوں نے جمیلہ سے پوچھا: "بہن، کیا بات ہے؟"
جمیلہ نے محمود کی طرف دیکھا جو سہا کھڑا تھا، اور کہا: "یہ لڑکا مجھ سے چھیڑ خانی کر رہا تھا . . . جب سے میں اس باغ میں داخل ہوئی ہوں، یہ میرا پیچھا کر رہا ہے"
سپاہیوں نے محمود کا سرسری جائزہ لیا اور پھر اُس کو گرفتار کر کے حوالات میں داخل کر دیا ـــــ لیکن اس کی ضمانت ہو گئی۔
اب مقدمہ شروع ہوا ـــــ مقدمے کی روئداد میں جانے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ یہ تفصیل طلب ہے ـــــ قصہ مختصر یہ ہے کہ محمود کا جرم ثابت ہو گیا، اور اُسے دو ماہ قید بامشقت کی سزا مل گئی۔
اُس کے والدین نادار تھے، اس لیے وہ سیشن کی عدالت میں اپیل نہ کر سکے ـــــ محمود سخت پریشان تھا کہ آخر اُس کا قصور کیا ہے؟ اُس کو اگر ایک لڑکی پسند آ گئی تھی اور اُس نے اُس سے چند باتیں کرنا چاہی تھیں تو کیا یہ جرم ہے، جس کی پاداش میں وہ دو ماہ کی قید بامشقت بھگت رہا ہے۔
جیل خانے میں وہ کئی مرتبہ بچوں کی طرح رویا ـــــ اُس کو مصوری کا شوق تھا، لیکن اُس سے وہاں چکی پسوائی جاتی تھی۔

ابھی اُسے جیل خانے میں آئے بیس روز ہی ہوئے تھے کہ اُسے بتایا گیا، اُس کی ملاقات آئی ہے ـــــ اُس نے سوچا، یہ ملاقاتی کون ہے؟ اُس کے والدین تو اُس سے سخت ناراض تھے اور والدہ اپاہج تھیں، اور کوئی اور رشتے دار تھے ہی نہیں۔
سپاہی اُسے دروازے کے پاس لے گیا، جو آہنی سلاخوں کا بنا ہوا تھا ـــــ ان سلاخوں کے پیچھے، اُس نے دیکھا، جمیلہ کھڑی ہے۔
وہ بہت حیرت زدہ ہوا ـــــ اُس نے سمجھا کہ شاید وہ کسی اور کو دیکھنے آئی ہو گی، مگر جمیلہ نے سلاخوں کے پاس آ کر اُس سے کہا: "میں آپ سے ملنے آئی ہوں"
محمود کی حیرت میں اور بھی اضافہ ہو گیا: "مجھ سے؟"
"جی ہاں . . . میں معافی مانگنے آئی ہوں کہ میں نے جلد بازی کی، جس کی وجہ سے آپ کو یہاں آنا پڑا"
محمود مسکرایا: "ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"
جمیلہ نے کہا: "یہ تو غالب ہے"
"جی ہاں غالب کے سوا کون ہو سکتا ہے، جو انسان کے جذبات کی ترجمانی کر سکے . . . میں نے آپ کو معاف کر دیا . . . لیکن میں یہاں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا، اس لیے کہ یہ میرا گھر نہیں ہے، سرکار

کا ہے۔۔۔اس کے لیے میں معافی کا خواستگار ہوں۔"

جمیلہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے: "میں آپ کی خادمہ ہوں۔"

چند منٹ اُن کے درمیان اور باتیں ہوئیں، جو محبت کے عہد و پیمان تھیں ـــــ جمیلہ نے اُس کو صابن کی ایک ٹکیہ دی، مٹھائی بھی پیش کی۔

اس کے بعد وہ ہر پندرہ دن کے بعد محمود سے ملاقات کرنے کے لیے آتی رہی۔ اِس دوران میں اُن دونوں کی محبت استوار ہو گئی۔

جمیلہ نے محمود کو ایک روز بتایا: "مجھے موسیقی سیکھنے کا شوق ہے۔۔۔آج کل میں خاں صاحب سلام علی خاں سے سبق لے رہی ہوں۔"

محمود نے اُس سے کہا: "مجھے مصوری کا شوق ہے۔۔۔ مجھے یہاں جیل خانے میں اور کوئی تکلیف نہیں۔۔۔ مشقت سے میں گھبراتا نہیں لیکن میری طبیعت جس فن کی طرف مائل ہے، اس کی تسکین نہیں ہوتی۔۔۔یہاں کوئی رنگ ہے نہ روغن، کوئی کاغذ ہے نہ پنسل۔۔۔بس چکی پیستے رہو۔"

جمیلہ کی آنکھیں پھر آنسو بہانے لگیں: "بس اب تھوڑے ہی دن باقی رہ گئے ہیں۔۔۔آپ باہر آئیں گے تو سب کچھ ہو جائے گا۔"

محمود دو ماہ کی قید کاٹنے کے بعد باہر آیا تو جمیلہ دروازے پر موجود تھی ـــــ اسی کالے برقعے میں، جو اب بھوسلا ہو گیا تھا اور جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔

دونوں آرٹسٹ تھے ـــــ اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ شادی کر لیں ـــــ چنانچہ شادی ہو گئی۔

جمیلہ کے ماں باپ کچھ اثاثہ چھوڑ گئے تھے۔ اُس سے اُنھوں نے ایک چھوٹا سا مکان بنایا اور پُر مسرت زندگی بسر کرنے لگے۔

محمود ایک آرٹ سٹوڈیو میں جانے لگا، تاکہ اپنی مصوری کا شوق پورا کر سکے ـــــ جمیلہ، خاں صاحب سلام علی خاں سے پھر تعلیم حاصل کرنے لگی۔

ایک برس تک وہ دونوں تعلیم حاصل کرتے رہے ـــــ محمود مصوری سیکھتا رہا اور جمیلہ موسیقی۔

اس کے بعد اُن کا بچا کھچا اثاثہ ختم ہو گیا اور نوبت فاقوں پر آگئی ـــــ دونوں آرٹ کے شیدائی تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ فاقے کرنے والے ہی صحیح طور پر اپنے آرٹ کی معراج تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنی اُس مفلسی کے زمانے میں بھی خوش تھے۔

ایک دن جمیلہ نے اپنے شوہر کو یہ مژدہ سنایا کہ اُسے ایک امیر گھرانے میں موسیقی سکھانے کی ٹیوشن مل رہی ہے۔

محمود نے یہ سن کر اُس سے کہا: "نہیں، ٹیوشن ویوشن بکواس ہے۔۔۔ہم لوگ آرٹسٹ ہیں۔"

اُس کی بیوی نے بڑے پیار کے ساتھ کہا: "لیکن میری جان، گزارہ کیسے ہوگا؟"
محمود نے اپنے پھوسڑے نکلے ہوئے کوٹ کا کالر بڑے امیرانہ انداز میں درست کرتے ہوئے جواب دیا:
"آرٹسٹ کو ان فضول باتوں کا خیال نہیں کرنا چاہیے . . . ہم آرٹ کے لیے زندہ رہتے ہیں، آرٹ ہمارے لیے زندہ نہیں رہتا۔"
جمیلہ یہ سُن کر بہت خوش ہوئی: "لیکن میری جان، آپ مصوری سیکھ رہے ہیں . . . آپ کو ہر مہینے فیس ادا کرنی پڑتی ہے، اس کا بندوبست بھی تو کچھ ہونا چاہیے . . . پھر کھانا پینا ہے، اس کا خرچ علیحدہ ہے۔"
"میں نے فی الحال مصوری کی تعلیم چھوڑ دی ہے . . . جب حالات موافق ہوں گے تو دیکھا جائے گا۔"
جمیلہ یہ سُن کر خاموش رہی۔
دوسرے دن جب وہ گھر آئی تو اُس کے پرس میں پندرہ روپے تھے، جو اُس نے اپنے خاوند کے حوالے کر دیے اور کہا: "میں نے آج سے ٹیوشن شروع کر دی ہے۔ یہ پندرہ روپے مجھے پیشگی ملے ہیں . . . آپ مصوری سیکھنے کا کام جاری رکھیں۔"
محمود کے مردانہ جذبات کو بڑی ٹھیس لگی: "میں نہیں چاہتا کہ تم ملازمت کرو . . . ملازمت مجھے کرنی چاہیے۔"
جمیلہ نے خاص انداز میں کہا: "ہائے، میں کوئی غیر ہوں . . . میں نے اگر کہیں تھوڑی دیر کے لیے ملازمت کر لی ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے . . . بہت اچھے لوگ ہیں، اور جس لڑکی کو میں تعلیم دیتی ہوں، بہت پیاری اور ذہین ہے۔"
یہ سُن کر محمود خاموش ہوگیا ـــــ اُس نے مزید گفتگو نہ کی۔
دوسرے ہفتے کے بعد وہ پچیس روپے لے کر آیا اور اُس نے اپنی بیوی سے کہا: "میں نے آج اپنی ایک تصویر بیچی ہے . . . خریدار نے اُسے بہت پسند کیا، لیکن خسیس تھا، صرف پچیس روپے دیے . . . اب امید ہے کہ میری تصویروں کی مارکیٹ چل نکلے گی۔"
جمیلہ مسکرائی: "ہم تو پھر کافی امیر آدمی ہو جائیں گے۔"
محمود نے اُس سے کہا: "جب میری تصویریں بکنا شروع ہو جائیں گی تو میں تمھیں ٹیوشن نہیں کرنے دوں گا۔"
جمیلہ نے اپنے خاوند کی ٹائی درست کی اور بڑے پیار سے کہا: "آپ میرے مالک ہیں۔ جو بھی حکم دیں گے، مجھے تسلیم ہوگا۔"
دونوں بہت خوش تھے، اس لیے کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے ـــــ محمود نے جمیلہ سے کہا: "اب تم کچھ فکر نہ کرو، میرا کام چل نکلا ہے . . . چار تصویریں کل یا پرسوں تک بِک جائیں

گی اور اچھے دام وصول ہو جائیں گے۔ پھر تم اپنی موسیقی کی تعلیم جاری رکھ سکو گی۔"

ایک دن جمیلہ جب شام کو گھر آئی تو اُس کے سر کے بالوں میں دُھنی ہوئی رُوئی کا غبار اِس طرح جما ہوا تھا جیسے کسی اُدھیڑ عمر آدمی کی داڑھی میں سفید بال۔

محمود نے اُس سے استفسار کیا: "یہ تُم نے اپنے بالوں کی کیا حالت بنا رکھی ہے . . . موسیقی سکھانے جاتی ہو یا کسی جننگ فیکٹری میں کام کرنے جاتی ہو؟"

جمیلہ نے، جو محمود کی نئی رضائی کی پُرانی رُوئی کو دُھن رہی تھی، مُسکرا کر کہا: "ہم آرٹسٹ لوگ ہیں، ہمیں کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہتا۔"

محمُود نے حُقّے کی نے مُنہ میں لے کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور کہا: "ہوش واقعی نہیں رہتا۔"

جمیلہ نے محمود کے بالوں میں اپنی اُنگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی: "یہ دُھنی ہوئی رُوئی کا غبار آپ کے سر میں کیسے آ گیا؟"

محمود نے حقّے کا ایک کش لگایا: "جیسے تمھارے سر میں آ گیا . . . ہم دونوں ایک ہی جننگ فیکٹری میں کام کرتے ہیں، صرف آرٹ کی خاطر . . . . . "

خوابِ خرگوش

ثریا ہنس رہی تھی، بے طرح ہنس رہی تھی۔ اُس کی ننھی سی کمر اُس ہنسی کے باعث دوہری ہوگئی تھی۔
اُس کی بڑی بہن کو بڑا غصّہ آیا ـــــ وہ آگے بڑھی تو ثریا پیچھے ہٹ گئی۔

بڑی بہن نے کہا "جا میری بہن، بڑے طاق میں سے میری چوڑیوں کا بکس اُٹھالا، پر ایسے کہ امّی جان کو خبر نہ ہو۔"

ثریا اپنی بڑی بہن سے پانچ برس چھوٹی تھی ـــــ بلقیس اُنیس کی تھی۔

ثریا نے منہ بناتے ہوئے اور ہنستے ہوئے کہا "اور جو نہ لاؤں تو؟"

بلقیس نے جل کر کہا "ایک فقط تو مجھ اللہ ماری کا کام نہیں کرے گی ۔ ۔ ۔ نگوڑیاں ہمسایاں چاہے تم سے اُپلے تھپوالیں!"

ثریا کو اپنی بہن پر پیار آگیا ـــــ وہ بلقیس کے گلے سے چمٹ گئی "نہیں باجی، ہمسایاں جائیں جہنم میں ۔ ۔ میں تو تمھاری ہر خدمت کے لیے تیار ہوں ۔ ۔ میں ابھی چوڑیوں کا بکس لاتی ہوں۔"

ثریا چٹکیوں میں بکس اٹھا لائی اور اس نے بلقیس سے بڑے جاسوسانہ انداز میں کہا "آپ ضرور سینما دیکھنے جا رہی ہیں"۔

"ثریا، تو اب زیادہ بک بک نہ کر۔۔ تیری قسم، میں سینما نہیں جا رہی ہوں"۔
ثریا نے بچپنے کے سے استفسار سے پوچھا! "تو پھر یہ تیاریاں کیوں ہو رہی ہیں؟"
"یہ تو میرا امتحان لینے کیا بیٹھ گئی ہے اور میں بیوقوف ہوں جو تیری ہر بات کا جواب دیے چلی جا رہی ہوں۔۔ تیری بحث تو کبھی ختم نہیں ہوگی کمبخت"۔

ثریا کہ ننھی سی جان تھی۔ بے حد افسردہ ہوگئی اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگا ـــــ اس نے اپنی بہن کا ہاتھ پکڑ لیا! "آپ ناراض ہوگئیں مجھ سے؟"

"چل دور ہو۔۔" بلقیس اپنے آپ سے، بلکہ ہر چیز سے بیزار ہو رہی تھی! "آج مجھے ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے، پر مصیبت یہ ہے کہ جانے امی جان اجازت دیتی ہیں یا نہیں۔۔ وہ کہیں گی! تو متواتر تین شاموں سے باہر جا رہی ہے۔۔" اور میں ان سے وعدہ کر چکی ہوں کہ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے پہنچ جاؤں گی"۔
ثریا نے پوچھا! "کس سے؟"
بلقیس نے غیرارادی طور پر جواب دیا! "لطیف صاحب سے۔۔" یہ کہہ کر وہ ایک دم خاموش ہوگئی۔
ثریا سوچنے لگی کہ یہ لطیف صاحب کون ہیں ـــــ ان کے ہاں تو کبھی اس نام کا کوئی آدمی نہیں آیا تھا ـــــ اس نے کشش و پنج میں اپنی بہن سے پوچھا! "یہ لطیف صاحب کون ہیں باجی؟"
"لطیف صاحب۔۔ مجھے کیا معلوم، کون ہیں۔۔ ارے۔۔ سچ مچ یہ کون ہیں؟" اور پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر بلقیس نے کہا! "ثریا، تو نے آج کا سبق یاد کیا۔۔ تو بہت وہ ہوگئی ہے، اسی لیے تو اوٹ پٹانگ سوال کرتی رہتی ہے!"
ثریا کی معصومیت کو ٹھیس پہنچی! "میں نے کبھی کوئی واہیات بات نہیں کی ہے۔۔ آپ نے کس لطیف صاحب سے ملنے کا وعدہ کیا ہوا ہے؟"
بلقیس اس کی معصومیت سے تنگ آگئی اور جھنجھلا کر بولی! "خاموش رہ۔۔"
اتنے میں اندر صحن سے بلقیس کی ماں کی آواز آئی! "بلقیس۔۔ بلقیس۔۔!"
بلقیس نے پرس میں سے ایک اکنی نکال کر ثریا کو دی اور ہولے لہجے میں کہا! "اکنی کی املی لے لینا۔۔ ہر روز ایک اکنی دیا کروں گی تجھے املی کے لیے اور دیکھ، آدھی املی آج میرے لیے رکھ چھوڑنا۔۔ امی مجھے بلا رہی ہیں۔۔ سن، جو باتیں ہوئی ہیں، ان کو نہ بتانا۔۔ لے، وہ خود ہی آ رہی ہیں۔۔" صحن کے آگے برآمدے کے فرش پر اس نے اپنی ماں کے قدموں کی چاپ سنی اور ثریا سے کہا! "بھاگ اب یہاں سے"۔

بلقیس کی ماں ـــــ ایک ادھیڑ عمر کی عورت، بہت غصیلی، ایک جابر ماں کے سے خدوخال ـــــ بلقیس کی ماں نے آتے ہی بلقیس کو ڈانٹا: "یہ جو میں دو گھنٹے سے تجھے بُلا رہی ہوں۔۔ تُونے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی ہے کیا؟"

بلقیس نے مسکین بلّی کی سی آواز میں جواب دیا: "نہیں تو۔۔۔"

بلقیس کی ماں کی آواز اور زیادہ بلند ہوگئی: "اور یہ میں نے کیا سُنا ہے؟"

"کیا امّی جان؟"

"کہ تو پھر آج باہر جا رہی ہے۔۔۔ شریف بہو بیٹیوں کی طرح تیرا گھر میں جی بھی نہیں لگتا۔۔ دیدے کا پانی ہی ڈھل گیا ہے۔"

بلقیس نے آنکھیں جھکا کر بڑی نرم و نازک آواز میں کہا: "آپ تو ناحق بگڑ رہی ہیں۔"

بلقیس کی ماں جہاں آرا غضبناک ہوگئی: "ابھی ابھی ایک آدمی تمھاری کسی سہیلی کے یہاں سے آیا تھا۔۔۔ کہتا تھا کہ بی بی بھول نہ جائیں۔ اُنھیں کالج کے جلسے میں جانا ہے۔"

بلقیس جھٹ سے بولی: "ہائے۔۔۔ جلسے میں۔۔۔؟ میں تو بالکل بھول گئی تھی۔۔۔ یہ جلسہ بہت ضروری ہے امّی جان۔۔۔ میں نہ گئی تو پرنسپل صاحبہ بہت بُرا مانیں گی۔۔۔ مجھے فوراً تیار ہونا چاہیے۔"

اُس کی ماں کو کالج کے جلسے جلوسوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور پھر اُسے بلقیس سے گھر کا کام کرانا تھا: "تو چل میرے ساتھ اور بیٹھ کے میرے سامنے آٹا گوندھ۔"

بلقیس نے اپنی سجاوٹ ایک نظر دیکھی اور بڑے پُر درد لہجے میں کہا: "لیکن امّی جان۔۔۔"

اُس کی ماں کا لہجہ کڑا ہوگیا: "نہیں۔۔۔ آج میرے ساتھ کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔۔۔ سمجھیں؟"

بلقیس نے ہار مان کر کہا: "آٹا گوندھنے کے بعد تو اجازت مل جائے گی نا؟"

اُس کی ماں زیرِ لب مسکرائی: "تب کی تب دیکھوں گی۔۔۔ چل بیٹھ جا میرے سامنے۔"

بلقیس وہیں کمرے میں بیٹھنے لگی، مگر ایک دم اُسے خیال آیا کہ باورچی خانہ اور صحن تو باہر ہیں، یہاں وہ اپنی ماں کا سر آٹا گوندھے گی ـــــ اُس نے کہا: "چلیے امّی جان۔"

دونوں باورچی خانے میں داخل ہوئیں، کچھ اِس طرح جیسے آگے آگے سپاہی اور پیچھے ہتھکڑی لگا ملزم۔

اُس کی ماں ایک پیڑھی پر اپنا بھاری بھرکم جسم ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھ گئی ـــــ پھر اُس نے بلقیس کی طرف دیکھا اور کہا: "ٹکر ٹکر میرا مُنہ کیا دیکھتی ہے۔۔۔ بیٹھ جا یہاں میرے سامنے۔"

گندے فرش پر پنجوں کے بل بیٹھنے کے بعد اُس نے منمنا کر پوچھا: "پانی کہاں ہے؟"

پانی اُس کے پاس ہی پڑا تھا اور ساتھ ہی پرات میں آٹے کی چھوٹی سی ڈھیری پڑی تھی ـــــ اُس نے ڈھیری میں گڑھا کر کے تھوڑا سا پانی بادلِ نخواستہ ڈالا اور آٹے کو ملا کر جلدی جلدی مکیاں مارنے لگی۔

یکایک اُس نے سامنے صحن میں لگے ہوئے کلاک کی طرف دیکھا ـــــ آٹھ بجنے والے تھے۔
اُس کی مٹھیاں ڈھیلی پڑگئیں ـــــ وہ سوچ رہی تھی کہ آٹا گوندھنے کے بعد کیا وہ ساڑھے آٹھ بجے پہنچ سکے گی۔

اُس کی ماں اُس کے سر پر کھڑی ہو گئی اور ایک دم چلّائی "بلقیس، یہ تو مکّیاں مار رہی ہے یا کسی کا سر سہلا رہی ہے"
وہ چونکی ـــــ اس کا جی چاہا کہ اپنا گیلے آٹے سے لتھڑے ہوئے ہاتھ کا مکّا بنا کر یا تو اپنی ماں کے سر پر دے مارے، یا پھر اپنے سر پر ـــــ لیکن اُس نے ساڑھے آٹھ بجے پہنچنا تھا، اس لیے اُس نے جلدی جلدی آٹا گوندھا اور فارغ ہو گئی۔
ہاتھ دھو کر اُس نے ثریا کو بلایا اور کہا "جاؤ، ایک تانگہ لے آؤ"
ثریا چلی گئی تو بلقیس نے آئینے میں خود کو دیکھا ـــــ اُس نے لپ اسٹک لگائی، کسی قدر بکھرے ہوئے بالوں کو درست کیا اور کرسی پر بیٹھ کر بڑے اضطراب میں ٹانگ ہلانے لگی۔
تھوڑی دیر کے بعد ثریا آ گئی اور اُس نے اپنی بڑی بہن سے کہا "باجی تانگا آ گیا ہے"
وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے برقعہ اُٹھایا ہی تھا کہ باہر صحن سے اُس کے بھائی کی آواز آئی "بلّی بلّی"
وہ چلّائی "کیا ہے بھائی جان؟"
اُس کے بھائی جان خود اندر تشریف لے آئے اور ہاتھوں نے اُس کے ہاتھوں میں اپنی قمیص تھماتے ہوئے کہا "دھوبی کمبخت نے پھر دو بٹن غائب کر دیے ہیں... مہربانی کر کے..."
اُسے محسوس ہوا کہ دو بٹن اُس کے سر پر دو پہاڑ بن کے ٹوٹ پڑے ہیں "نہیں بھائی جان... مجھے ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے کالج کے جلسے میں پہنچنا ہے"
اُس کے بھائی جان نے بڑے اطمینان اور بڑی برادرانہ محبّت سے کہا "تم وقت پر پہنچ جاؤ گی... نو، یہ دو بٹن ہیں... تم یوں چٹکیوں میں ٹانک دو گی"
"نہیں بھائی جان، وقت ہو گیا ہے... سوا آٹھ ہو چکے ہیں"
"امّی جان نے تمھیں اجازت دے دی ہے؟"
"نہیں"
"تو بٹن ٹانک دو... اجازت میں لے دوں گا"
"سچ؟"
"میں نے آج تک تم سے کوئی جھوٹی بات کہی ہے؟"
"تو لائیے پھر" بلقیس نے سوئی میں دھاگہ پرو کر بٹن ٹانکنے شروع کر دیے ـــــ اُس کی انگلیوں

میں بلا کی پھرتی تھی۔ دو منٹ کے کم عرصے میں اُس نے اپنے بھائی جان کی قمیص میں دو بٹن لگا دیے۔
وہ بہت ممنون و متشکر ہوئے ـــــــ باہر جا کر انھوں نے اپنی ماں سے سفارش کی کہ وہ بلقیس کو کالج کے جلسے میں جانے کی اجازت دے دیں۔
سفارش سُن کر ماں اُن پر برس پڑی: "تم دونوں آوارہ گرد ہو۔۔ گھر میں نہ تمھارا جی لگتا ہے نہ بلقیس کا۔۔ دیکھو، مَیں تُم سے کہے دیتی ہوں، نہ تم کہیں جاؤ گے نہ بلقیس۔۔ گھر میں بیٹھو اور کوئی کام کرو۔"
"لیکن امّی جان، مَیں تو آپ ہی کے لیے باہر جا رہا ہوں۔"
"مجھے کیا تکلیف ہے کہ تم میرے لیے باہر جا رہے ہو۔۔ میرے لیے جب بھی تم باہر گئے ہو، ڈاکٹر کو لانے کے لیے گئے ہو۔"
"امّی جان، آپ نے ہی تو کہا تھا کہ آپ کے زیوروں کا پتا کروں۔۔ جس سُنار کو آپ نے زیور بننے کے لیے دیے تھے، وہ چار روز سے غائب ہے۔"
"ہائیں تُم نے مجھ سے پہلے کیوں نہ کہا۔۔ کہاں غائب ہو گیا ہے وہ مُوا سُنار؟"
"اب جاؤں گا تو معلوم کر دوں گا۔"
"جاؤ، جلدی جاؤ اور آ کر مجھے بتاؤ کہ وہ واپس آ گیا یا نہیں۔۔ میرا سونا اُس سے واپس لے آنا۔۔ چار تولے، دو ماشے اور چار رتیاں۔"
"بہت بہتر۔۔ بلقیس کو بھی اجازت دے دیجیے۔"
ماں نے بادلِ نخواستہ کہا: "چلی جائے، مگر مجھے اُس کا ہر روز شام کو گھر سے باہر رہنا پسند نہیں۔"
بلقیس کے بھائی جان زیرِ لب مُسکرائے اور اندر جا کر انھوں نے اپنی بہن کو خوش خبری سُنائی کہ اُن کا فراڈ چل گیا ہے اور اجازت مِل گئی ہے۔
بلقیس نے اپنا بُرقعہ پہنا ـــــــ وہ باہر نکلنے ہی والی تھی کہ اُس کی ماں نے اُسے بلایا اور کہا: "دیکھو بلقیس، تُم جا رہی ہو لیکن میرا ایک کام کرتی جاؤ۔"
اُس کو محسوس ہوا، اُس کا ریشمی بُرقعہ لوہے کی چادر بن گیا ہے: "بتائیے امّی جان۔"
"ایک خط لکھوانا ہے تُم سے۔"
اُس نے ایک شکست خوردہ اور غلام کے مانند ٹھنڈی سانس بھر کے کہا: "لائیے، لِکھ دیتی ہوں۔"
اُس کے جسم کا رواں رواں رو رہا تھا ـــــــ اُس نے جُوں تُوں خط مکمّل کیا۔
باہر تانگہ کب سے کھڑا تھا ـــــــ وہ تانگے میں بیٹھ گئی اور جہاں اُسے پہنچنا تھا، پہنچ گئی۔
اُس نے دروازے پر دستک دی مگر اُسے کوئی جواب نہ ملا۔
اُس نے کواڑوں کو غصّے میں آ کر زور سے دھکیلا ـــــــ کواڑ کُھلے ہوئے تھے ـــــــ وہ گرتے

گرتے بچی۔

اندر اُس کا محبوب خواب خرگوش تھا ـــــ اُس نے اُس کو جگانے کی کوشش کی مگر وہ بیدار نہ ہوا۔

وہ جل بھن گئی اور بڑبڑائی: "میری جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ یہاں ٹھہرے . . . میں اتنی مصیبتوں سے یہاں آئی ہوں اور جناب معلوم نہیں، بھنگ پی کر سو رہے ہیں۔"

پھوجا حرام دا

ٹی ہاؤس میں حرامیوں کی باتیں شروع ہوئیں تو یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔
ہر ایک نے کم از کم ایک حرامی کے متعلق اپنے تاثرات بیان کیے جس سے اُس کو اپنی زندگی میں واسطہ پڑ چکا تھا ـــــ کوئی جالندھر کا تھا، کوئی سیالکوٹ کا، کوئی لدھیانے کا اور کوئی لاہور کا، مگر سب کے سب اسکول یا کالج کی زندگی سے متعلق تھے۔

مہر فیروز صاحب سب سے آخر میں بولے ـــــ آپ نے کہا! "امرتسر میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جو پھوجے حرام دے کے نام سے ناواقف ہو۔ یوں تو اُس شہر میں اور بھی کئی حرام زادے تھے مگر اُس کے پلّے کے نہیں تھے۔ وہ نمبر ایک حرام زادہ تھا۔ اسکول میں اُس نے تمام ماسٹروں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ہیڈ ماسٹر، جس کو دیکھتے ہی بڑے بڑے شیطان لڑکوں کا پیشاب خطا ہو جاتا تھا، پھوجے سے بہت گھبراتا تھا، اس لیے کہ اُس پر اُن کے مشہور بید کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے تنگ آ کر اُس کو مارنا چھوڑ دیا تھا۔۔۔

"یہ دسویں جماعت کی بات ہے۔۔۔ ایک دن یار لوگوں نے اُس سے کہا: دیکھو پھوجے، اگر تم کپڑے

اُتار کر ننگ دھڑنگ اسکول کا ایک چکر لگاؤ تو ہم تمہیں ایک روپیہ دیں گے۔۔؛ بھوجے نے روپیہ لے کر کان میں اُڑسا، کپڑے اُتار کر بستے میں باندھے اور سب کے سامنے ننگ دھڑنگ چلنا شروع کر دیا۔ وہ جس کلاس کے پاس سے گزرتا وہ زعفران زار بن جاتی۔۔۔ چلتے چلتے وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر کے پاس پہنچ گیا۔ اُس نے چک اٹھائی اور غڑاپ سے اندر داخل ہو گیا۔ معلوم نہیں، کیا ہوا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب سخت بوکھلائے ہوئے باہر نکلے اور اُنھوں نے چپڑاسی کو بلا کر اُس سے کہا؛ جاؤ، بھاگ کے بھوجے کے گھر جاؤ اور اُس کے کپڑے لے آؤ۔۔ کہنا ہے، مسجد کے سقاوے میں نہا رہا تھا کہ کوئی چور اُس کے کپڑے اُٹھا کر لے گیا۔۔؛

"دینیات کے ماسٹر مولوی پوٹیٹو تھے۔۔۔ معلوم نہیں، انھیں پوٹیٹو کس رعایت سے کہتے تھے کیونکہ آلوؤں کے تو داڑھی نہیں ہوتی۔۔۔ اُن سے بھوجا ذرا دبتا تھا۔۔۔ ایک دن ایسا ہوا کہ انجمن کے ممبروں کے سامنے، جو اسکول چلاتے تھے، مولوی صاحب نے غلطی سے بھوجے سے ایک آیت کا ترجمہ پوچھ لیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ خاموش رہتا مگر بھر بھوجا حرام دا بھجا نا کیسے جاتا۔ اُس کے مُنہ میں جو آیا اُس نے اول جلول بک دیا۔ مولوی پوٹیٹو کے پسینے چھوٹ گئے۔ ممبروں کے جاتے ہی اُنھوں نے اپنا عصا اٹھایا اور بھوجے کو وہ چار چوٹ کی مار ماری کہ وہ بلبلا اُٹھا مگر پھر بھی بڑے ادب سے کہتا رہا؛ مولوی صاحب، میرا کوئی قصور نہیں۔۔ مجھے کلمہ ٹھیک سے نہیں آتا اور آپ نے ایک پوری آیت کا مطلب پوچھ لیا۔۔۔ مارنے سے بھی مولوی پوٹیٹو کا جی ہلکا نہ ہوا۔ وہ بھوجے کے باپ کے پاس گئے اور اُس سے شکایت کی۔ بھوجے کے باپ نے اُن کی سب باتیں سُنیں اور بڑے رحم ناک لہجے میں کہا؛ مولوی صاحب، میں اُس سے خود عاجز آ گیا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس کی اصلاح کیسے ہو سکتی ہے۔۔۔ ابھی کل کی بات ہے۔ میں پاخانے گیا تو اُس نے باہر سے کُنڈی چڑھا دی۔ میں اندر سے بہت گرجا اور اُسے بے شمار گالیاں دیں تو وہ یہی کہتا رہا کہ اگر میں اٹھنی دینے کا وعدہ کروں تو دروازہ کُھلے گا اور اگر وعدہ کر کے پھر جاؤں گا تو وہ اگلی مرتبہ کُنڈی میں تالہ بھی ڈال دے گا۔۔ ناچار پہلے وعدہ کرنا پڑا، پھر اٹھنی دینی پڑی۔ اب بتائیے، میں ایسے نابکار لڑکے کا کیا کروں۔۔؛

"اللہ ہی بہتر جانتا تھا کہ اُس کا کیا ہو گا۔۔۔ پڑھنا وڑھنا خاک بھی نہیں تھا۔۔۔ انٹرنس کے امتحان ہوئے تو سب کو یقین تھا کہ بہت بُری طرح فیل ہو گا، مگر نتیجہ نکلا تو سب سے زیادہ نمبر اُسی کے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ کالج میں داخل ہو، مگر اُس کے باپ کی یہ خواہش تھی کہ وہ کوئی ہنر سیکھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دو برس تک آوارہ پھرتا رہا۔۔۔ اس دوران میں اُس نے جو حرام زدگیاں کیں، اُن کی فہرست بہت لمبی ہے۔۔۔

"ننگا۔ آخر اُس کے باپ نے بالآخر اُسے کالج میں داخل کرا دیا۔ پہلے ہی دن اُس نے یہ شرارت کی کہ منیجمنٹ کے پروفیسر کی سائیکل اُٹھا کر ایک درخت کی سب سے اونچی ٹہنی پر لٹکا دی۔ سب حیران کہ سائیکل وہاں کیسے پہنچی کیونکہ، مگر وہ لڑکے جو اسکول میں بھوجے کے ساتھ پڑھ چکے تھے، اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ کارستانی بھوجے کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اس ایک شرارت ہی سے اُس کا پورے کالج سے تعارف ہو گیا۔۔۔

"اسکول میں اُس کی سرگرمیوں کا میدان محدود تھا۔ کالج میں یہ میدان بہت وسیع ہوگیا۔۔ پڑھائی میں، کھیلوں میں مشاعروں اور مباحثوں میں، قیامت کی شرارتوں میں، ہر جگہ پھوجے کا نام روشن تھا اور تھوڑے ہی دنوں میں اُس کا نام اتنا روشن ہوا کہ سارے شہر میں اُس کے غنڈے پنے کی دھاک بیٹھ گئی اور وہ بڑے بڑے جگادری بدمعاشوں کے کان کاٹنے لگا۔۔۔

"اس کا قد ناٹا تھا مگر بدن کسرتی تھا۔ اُس کی ہیڈ ٹکر بہت مشہور تھی۔ وہ ایسے زور سے مدِمقابل کے سینے میں یا پیٹ میں اپنے سر سے ٹکر مارتا کہ مدِمقابل کے سارے وجود میں زلزلہ سا آجاتا۔۔

"ابتداء کے دوسرے سال میں اُس نے تفریحاً پرنسپل کی نئی موٹر کے پٹرول ٹینک میں چار آنے کی شکر ڈال دی جس نے کار کا سارا انجن غارت کر دیا۔ پرنسپل کو کسی نہ کسی طریقے سے معلوم ہوگیا کہ یہ خطرناک شرارت پھوجے کی ہے، مگر حیرت ہے اُنھوں اُس کو معاف کر دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پھوجے کو اُن کے بہت سے راز معلوم تھے۔۔۔

"یہ وہ زمانہ تھا، جب کانگریس کا بہت زور تھا۔۔ انگریزوں کے خلاف کُھلم کُھلا جلسے ہونے تھے۔ حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کئی ناکام سازشیں ہو چکی تھیں۔ گرفتاریوں کی بھرمار تھی۔ سب جیل باغیوں سے پُر تھے۔ آئے دن ریل کی پٹریاں اُکھاڑی جاتی تھیں۔ خطوں کے بھکوں میں آتش گیر مادہ ڈالا جاتا تھا۔ بم بنائے جارہے تھے، پستول برآمد ہوتے تھے۔ بغرض کہ ایک ہنگامہ برپا تھا جس میں اسکولوں اور کالجوں کے طالب علم بھی شامل تھے۔۔۔

"پھوجا سیاسی آدمی بالکل نہ تھا۔۔ میرا خیال ہے، اُس کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مہاتما گاندھی کون ہے، لیکن جب اچانک ایک روز اُسے پولیس نے گرفتار کر لیا اور وہ بھی ایک سازش کے سلسلے میں، تو سب کو بڑی حیرت ہوئی۔۔۔

"اس سے پہلے کئی سازشیں پکڑی جا چکی تھیں۔ سانڈرس کے قتل کے سلسلے میں بھگت سنگھ اور دت کو پھانسی ہو چکی تھی۔ اس لیے یہ نیا معاملہ بھی کچھ سنگین ہی معلوم ہوتا تھا۔۔ الزام یہ تھا کہ مختلف کالجوں کے لڑکوں نے مل کر ایک خفیہ جماعت بنائی ہے جس کا مقصد حضور ملک معظم کی سلطنت کا تختہ اُلٹنا ہے۔۔۔

"کچھ لڑکوں نے کالج کی لیبارٹری سے پکرک ایسڈ چرایا تھا جو بم بنانے کے کام آتا ہے۔۔ پھوجے کے بارے میں شبہ تھا کہ وہ اُس چوری میں شریک تھا اور اُس کو تمام خفیہ باتوں کا علم تھا۔۔۔

"اُس کے ساتھ کالج کے دو اور لڑکے بھی پکڑے گئے تھے۔ اُن میں ایک مشہور بیرسٹر کا لڑکا تھا اور دوسرا رئیس زادہ۔ دونوں ڈاکٹری معائنے کے مطابق مریض تھے، اس لیے پولیس کی مار پیٹ سے بچ گئے۔۔ شامت غریب پھوجے حرام دے کی آئی۔ تھانے میں اس کو لٹکا لٹکا کر پیٹا گیا۔ برف کی سلوں پر کھڑا کیا گیا۔ بغرض کہ ہر قسم کی جسمانی اذیت اُسے پہنچائی گئی کہ وہ راز کی باتیں اُگل دے، مگر وہ بھی کُتّے کی ایک ہڈی تھا، ٹس سے مس نہ ہوا۔ بلکہ

تھانے میں بھی کمبخت، اپنی شرارتوں سے باز نہ آیا . . .

"ایک مرتبہ جب وہ مار برداشت نہ کر سکا تو اُس نے تھانیدار سے ہاتھ روک لینے کی درخواست کی اور وعدہ کیا کہ وہ سب کچھ بتا دے گا . . . وہ بالکل نڈھال تھا، اِس لیے اُس نے گرم گرم دودھ اور جلیبیاں مانگیں . . جب اُس کی طبیعت قدرے بحال ہوئی تو تھانیدار نے کاغذ قلم سنبھالا اور اُس سے کہا: 'اب بتاؤ . . .' پھوجے نے اپنے مار کھائے ہوئے اعضا کا جائزہ انگڑائی لے کر لیا اور جواب دیا: 'اب کیا بتاؤں، طاقت آگئی ہے . . . چڑھا دو پھر مجھے ٹکٹکی پر . . .'

ویسے اور بھی کئی قصّے ہیں جو مجھے یاد نہیں رہے، مگر یہ قصّہ بہت پُر لطف ہے . . . ملک حفیظ، جو ہمارا ہم جماعت تھا، اُس کی زبان سے آپ سُنتے تو اور ہی مزا آتا . . .

"ایک دن پولیس کے دو سپاہی پھوجے کو عدالت میں پیش کرنے کے لیے لے جا رہے تھے کہ کچہری میں اُس کی نظر ملک حفیظ پر پڑ گئی جو کسی کام سے وہاں آیا تھا . . . ملک حفیظ کو دیکھتے ہی پھوجا پکارا: 'اسلام علیکم حفیظ صاحب . . .' ملک حفیظ چونکا ۔ پھوجا ہتھکڑیوں میں اُس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا: 'ملک صاحب، بہت اداس ہو گیا ہوں . . جی چاہتا ہے، آپ بھی آجائیں میرے پاس . . . بس میرا نام لے دینا ہی کافی ہے . . .'

"ملک حفیظ نے جب پھوجے کی بات سُنی تو اُس کی رُوح قبض ہو گئی . . . پھوجے نے ملک حفیظ کو ڈھارس دی: 'گھبراؤ نہیں ملک، میں تو مذاق کر رہا ہوں . . . ویسے میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ . . .' اب آپ ہی بتائیے کہ پھوجا کس لائق تھا۔ ملک حفیظ گھبرا رہا تھا اور کنی کترا کے بھاگنے ہی والا تھا کہ پھوجے نے کہا: 'بھئی اور تو ہم سے کچھ ہو نہیں سکتا، کہو تو تمہارے بدبودار کنوئیں کی گار نکلوا دیں . . .'

"ملک حفیظ ہی آپ کو بتا سکتا ہے کہ پھوجے کو اُس کنوئیں سے کتنی نفرت تھی . . . اُس کنوئیں کے پانی سے ایسی بساند آتی تھی جیسی مَرے ہوئے چوہوں سے آتی ہے . . . معلوم نہیں، لوگ اُسے صاف کیوں نہیں کراتے تھے . . .

"ایک ہفتے کے بعد، جیسا کہ ملک حفیظ کا بیان ہے، وہ باہر نہانے کے لیے نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ دو تین ٹوبے کنوئیں کی گندگی نکالنے میں مصروف ہیں . . . ملک حفیظ بہت حیران ہوا کہ ماجرا کیا ہے ۔ ٹوبوں کو بلایا کس نے ہے . . . پڑوسیوں کا خیال تھا کہ بڑے ملک صاحب کو بیٹھے بیٹھے خیال آ گیا ہو گا کہ چلو کنوئیں کی صفائی ہو جائے، لوگ بھی کیا یاد رکھیں گے . . . لیکن پڑوسیوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ چھوٹے ملک کو اس بارے میں کچھ علم نہیں اور یہ کہ بڑے ملک صاحب تو شکار پر گئے ہوئے ہیں تو انھیں بھی حیرت ہوئی . . . پولیس کے بے وردی سپاہیوں سے پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ پھوجے حرام دے کی نشاندہی پر کنوئیں میں سے بم نکلوا رہے ہیں . . .

"بہت دیر تک گندگی نکلتی رہی ۔ پانی صاف شفاف ہو گیا، مگر بم تو کیا، ایک چھوٹا سا پٹاخہ بھی برآمد

نہ ہوا۔ پولیس بہت بھنائی۔ چنانچہ پھوجے سے باز پُرس ہوئی۔ اُس نے مسکرا کر تھانیدار سے کہا: "بھولے بادشاہو، ہمیں تو اپنے یار کا کنُواں صاف کرانا تھا، سو ہم نے کرالیا۔ ۔ ۔"

"بڑی خوبصورت شرارت تھی، مگر پولیس نے پھوجے کو وہ مار کہ مار مار کر اَدھ مُوا کر دیا۔ ۔ ۔ اور پھر ایک دن یہ خبر آئی کہ پھوجا سلطانی گواہ بن گیا ہے۔ اُس نے وعدہ کر لیا ہے کہ وہ سب کچھ بک دے گا۔ ۔ ۔

"کہتے ہیں، اُس پر بڑی لعن طعن ہوئی۔ اُس کے دوست ملک حفیظ نے بھی، جو حکومت سے بہت ڈرتا تھا، اُس کو بہت گالیاں دیں: 'حرام زادہ ڈر کے مارے غدار بن گیا ہے۔ ۔ معلوم نہیں، اب کس کس کو پھنسائے گا۔ ۔ ۔'

"بات اصل میں یہ تھی کہ وہ مار کھا کھا کے تھک گیا تھا۔ جیل میں اُس کو کسی سے ملنے نہیں دیا جاتا تھا۔ مرغن غذائیں کھانے کو دی جاتی تھیں، مگر سونے نہیں دیا جاتا تھا۔ کم بخت کو نیند بہت پیاری تھی، اس لیے تنگ آ کر اس نے سچے دل سے وعدہ کر لیا کہ وہ بم بنانے کی سازش کے جملہ حالات بتا دے گا۔

"رکھا تو اُسے جیل ہی میں گیا، مگر اب اُس پر کوئی سختی نہ تھی۔ کئی دن تو اُس نے آرام کیا کہ اُس کے بند بند ڈھیلے ہو چکے تھے۔ ۔ ۔ اچھی خوراک ملی اور بدن پر مالشیں ہوئیں تو وہ بیان لکھوانے کے قابل ہو گیا۔

"صبح لسّی کے یہ دو بڑے گلاس پی کر وہ اپنی داستان شروع کر دیتا۔ تھوڑی دیر کے بعد ناشتہ آتا تو اُس سے فارغ ہو کر وہ پندرہ بیس منٹ آرام کرتا اور پھر کرسی سے کرسی ملا کر اپنا بیان جاری رکھتا۔۔۔

"آپ محمد حسین اسٹینو گرافر سے پوچھیے، جس نے پھوجے کا بیان ٹائپ کیا تھا۔ ۔ ۔ اُس کا کہنا ہے کہ پھوجے حرام دے نے پُورا ایک مہینہ لیا اور وہ سارا جال کھول کے رکھ دیا جو سازشیوں نے ملک کے اِس کونے سے اُس کونے تک بچھایا ہوا تھا اور مزید بچھانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اُس نے سینکڑوں آدمیوں کے نام لیے اور ایسی ہزاروں جگہوں کا نام بتایا جہاں سازشی لُک چھُپ کے ملتے تھے اور حکومت کا تختہ اُلٹنے کی ترکیبیں سوچتے تھے۔

"وہ بیان، محمد حسین اسٹینو گرافر کا کہنا ہے، فُل اسکیپ کے ڈھائی سو صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔۔ جب پھوجے کا بیان ختم ہوا تو پولیس نے اُسے سامنے رکھ کر پلان بنایا۔ چنانچہ فوراً نئی گرفتاریاں عمل میں آئیں اور ایک بار پھر پھوجے کی ماں بہن پُنی جانے لگی۔

"اخباروں نے بھی دبی زبان میں پھوجے کے خلاف کافی زہر اُگلا۔ ۔ ۔ اکثریت حکام کے خلاف تھی، اِس لیے پھوجے کی غداری کی ہر جگہ مذمّت ہونے لگی۔

"پھوجا جیل میں تھا جہاں اُس کی خوب خاطر تواضع ہو رہی تھی۔ ۔ ۔ یہ بڑی طرّے والی کلف لگی پگڑی سر پر باندھے، دو گھوڑے کی بوسکی کی قمیص اور چالیس ہزار لٹھے کی گھیرے دار شلوار پہنے وہ جیل میں یُوں ٹہلتا تھا جیسے کوئی افسر معائنہ کر رہا ہو۔

"جب ساری گرفتاریاں عمل میں آگئیں اور پولیس نے اپنی کارروائی مکمل کر لی تو سازش کا یہ معرکہ انگیز

کیس عدالت میں پیش ہوا۔ لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔

"پولیس کی حفاظت میں جب بھوجا نمودار ہوا تو غصّے سے بھرے ہوئے نعرے بلند ہوئے : پھوجا حرام دے : مُردہ باد . . . پھوجا حرامدا : مُردہ باد . . . : ہجوم بہت مشتعل تھا اور خطرہ تھا کہ بھوجے پر ٹوٹ نہ پڑے، اس لیے پولیس کو لاٹھی چارج کرنا پڑا جس کے باعث کئی آدمی زخمی ہوئے۔

"عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ . جب بھوجے سے پوچھا گیا کہ وہ اُس بیان کے متعلق کیا کہنا چاہتا ہے جو اُس نے پولیس کو دیا تھا تو اُس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا : جناب، میں نے کوئی بیان ویان نہیں دیا ہے . . . ان لوگوں نے خود ہی ایک پلندہ سا تیار کیا تھا اور زبردستی مجھ سے دستخط کروا لیے تھے . . : یہ سُن کر انسپکٹر پولیس کی، بقول بھوجے، بھمبیری بھول گئی۔ اور جب یہ خبر اخباروں میں چھپی تو سب چکرا گئے کہ بھوجے حرام دے نے یہ کیا نیا چکّر چلایا ہے۔

"چکّر نیا ہی تھا، کیونکہ عدالت میں اُس نے ایک نیا بیان لکھوانا شروع کر دیا جو پہلے بیان سے بالکل مختلف تھا . . . نیا بیان قریب پندرہ دن میں ختم ہوا، اور جب ختم ہوا تو فل اسکیپ کے ایک سو اٹھاون صفحے کالے ہو چکے تھے . . . بھوجے کا کہنا ہے کہ اُس نئے بیان سے جو حالت پولیس والوں کی ہوئی، ناقابلِ بیان ہے . . . پولیس نے جو عمارت کھڑی کی تھی کمبخت نے اُس کی ایک ایک اینٹ اکھاڑ کے رکھ دی . . .

"سارا کیس چوپٹ ہو گیا . . . نتیجہ یہ نکلا کہ اُس سازش میں جتنے لوگ گرفتار ہوئے تھے، اُن میں سے اکثر بری ہو گئے۔ دو کو تین تین برس کی اور پانچ کو چھ چھ مہینے کی سزائے قید ہوئی"

جو لوگ یہ قصّہ فیروز صاحب سے سُن رہے تھے، اُن میں سے ایک نے پوچھا : "اور بھوجے کو؟"

مہر فیروز صاحب نے کہا : "بھوجے کو کیا ہونا تھا . . . وہ تو وعدہ معاف، یعنی سلطانی گواہ تھا"

سب نے بھوجے کی حیرت انگیز ذہانت کو سراہا کہ اُس نے پولیس کو کس صفائی سے غچہ دیا۔

ایک نے، جس کے دل و دماغ کو بھوجے حرام دے کی شخصیت نے بہت زیادہ متاثر کیا تھا، مہر فیروز صاحب سے پوچھا : "بھوجا آج کل کہاں ہوتا ہے؟"

"یہیں لاہور میں ہے . . . آڑھت کی دکان کرتا ہے"

اتنے میں بیرا بل لے کر آیا اور مہر فیروز صاحب کے سامنے رکھ دیا، کیونکہ چائے وغیرہ کا آرڈر انھوں نے دیا تھا۔

بھوجے کی شخصیت سے متاثر شدہ صاحب نے بل دیکھا اور اُن کا بڑھتا ہوا ہاتھ رُک گیا۔ اس لیے کہ رقم زیادہ تھی۔ چنانچہ وہ ایسے ہی مہر فیروز صاحب سے مخاطب ہوئے : "آپ کے اِس بھوجے سے کبھی ملنا چاہیے"

مہر فیروز اُٹھے : "آپ اُس سے مل چکے ہیں . . . یہ خاکسار ہی بھوجا حرام دا ہے . . . بل آپ ادا کر دیجیے گا . . . السلام علیکم" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔ ○○

راجو

سن اکتیس کے شروع ہونے میں صرف رات کے چند برفائے ہوئے گھنٹے باقی تھے۔

وہ لحاف میں سردی کی شدّت کے باعث کانپ رہا تھا۔ وہ پتلون اور کوٹ سمیت لیٹا ہوا تھا لیکن اِس کے باوجود سردی کی لہریں اُس کی ہڈیوں تک پہنچ رہی تھیں۔

وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے اپنے کمرے کی سبز روشنی میں، جو سردی میں اضافہ کر رہی تھی، زور زور سے ٹہلنا شروع کر دیا کہ اُس کا دَورانِ خُون تیز ہو جائے۔

تھوڑی دیر یُوں چلنے پھرنے کے بعد جب اس کے جسم کے اندر تھوڑی سی حرارت پیدا ہو گئی تو وہ آرام کُرسی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سُلگا کر اپنے دماغ کو ٹٹولنے لگا ــــــ اُس کا دماغ چونکہ بالکل خالی تھا، اِس لیے اُس کی قوّتِ سامعہ بہت تیز ہو گئی تھی۔

کمرے کی ساری کھڑکیاں بند تھیں مگر وہ باہر گلی میں ہوا کی مدھم سے مدھم گنگناہٹ بھی بڑی آسانی سے سُن رہا تھا۔

اُس گنگناہٹ میں اُسے انسانی آوازیں سنائی دیں ـــــ ایک دبی دبی سی چیخ دسمبر کی آخری رات کی خاموشی میں چابک کے اُول کی طرح اُبھری اور پھر کسی کی التجائیہ آواز لرزی۔

وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے کھڑکی کی درز میں سے باہر کی طرف دیکھا۔

وہی، وہی لڑکی، سوداگروں کی نوکرانی میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے کھڑی تھی، صرف ایک سفید بنیان پہنے ـــــ لالٹین کی روشنی میں یُوں معلوم ہو رہا تھا کہ اُس کے بدن پر برف کی ایک پتلی سی تہہ جم گئی ہے۔

بنیان کے نیچے لڑکی کی بد نما چھاتیاں ناریلوں کے مانند لٹک رہی تھیں اور وہ اِس انداز میں کھڑی تھی گویا ابھی ابھی کُشتی سے فارغ ہوئی ہے۔

لڑکی کو اِس حالت میں دیکھ کر اُس کے صناعانہ جذبات کو دھچکا سا لگا۔

اتنے میں کسی مرد کی بھینچی بھینچی سی آواز اُس کو سُنائی دی "خُدا کے لیے اندر چلی آؤ... کوئی دیکھ لے گا تو آفت ہی آجائے گی۔" آواز سوداگر بچے کی تھی کہ وہ پہچانتا تھا۔

وحشی بلی کی طرح لڑکی نے غُرّا کر جواب دیا "میں نہیں آؤں گی... بس ایک بار جو کہہ دیا کہ نہیں آؤں گی۔"

سوداگر بچے نے التجا کے طور پر لڑکی سے کہا "خُدا کے لیے اُونچا نہ بولو راجو، کوئی سُن لے گا۔"

"تو اُس کا نام راجو ہے۔" اُس نے من ہی من میں کہا۔

راجو نے اپنی لنڈوری چُٹیا کو جھٹکا دے کر سوداگر بچے سے کہا "سُن لے، ساری دُنیا سُن لے، خُدا کرے ساری دُنیا سُن لے... اگر تم مجھے اپنے کمرے کے اندر آنے کے لیے کہو گے تو میں خود محلے بھر کو جگا کر سب کچھ کہہ دوں گی۔"

راجو اُسے نظر آرہی تھی مگر سوداگر بچہ، جس سے وہ مخاطب تھی، اُس کی نظروں سے اوجھل تھا۔

اُس نے ایک لمبا اور گہرا سانس لے کر پھر کھڑکی کی بڑی درز سے راجو کو دیکھا، اور اُس کے بدن پر جھرجھری سی طاری ہو گئی ـــــ اگر راجو ساری کی ساری ننگی ہوتی تو شاید اُس کے صناعانہ جذبات کو ٹھیس نہ پہنچتی... راجو کے جسم کے جو حصّے ننگے تھے، اُس کے جسم کے مستور حصّوں کو عریاں کر رہے تھے۔

راجو میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے کھڑی تھی اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ عورت کے متعلق اُس کے جذبات اپنے کپڑے اُتار رہے ہیں۔

راجو کی غیر متناسب بانہیں، جو کاندھوں تک ننگی تھیں، نفرت انگیز طور پر لٹک رہی تھیں، مردانہ بنیان اور گول گلے میں سے اُس کی نیم پختہ ڈبل روٹی ایسی موٹی اور نرم چھاتیاں کچھ اس انداز سے باہر جھانک رہی تھیں گویا سبزی ترکاری کی ٹوٹی ہوئی ٹوکری میں سے گوشت کے ٹکڑے دکھائی دے رہے ہوں، حد سے زیادہ استعمال شدہ گھسی ہوئی پتلی بنیان کا نچلا گھیرا خود بخود اُوپر کو اُٹھ گیا تھا اور راجو کی ناف کا گڈھا اس

کے نخیرے آٹے ایسے پھُولے ہوئے پیٹ پر یُوں دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی نے انگلی کھبو دی ہو۔

وہ نظارہ دیکھ کر اُس کے دماغ کا ذائقہ خراب ہوگیا ـــــ اُس نے چاہا کہ کھڑکی سے ہٹ کر اپنے بستر پر لیٹ جائے اور سب کچھ بھُول بھال کر سو جائے، لیکن جانے کیوں وہ درز پر آنکھ جمائے کھڑا رہا۔

راجو کو اُس حالت میں دیکھ کر اُس کے دل میں نفرت پیدا ہوگئی تھی اور شاید وہ اُسی نفرت کی وجہ سے راجو میں دلچسپی لے رہا تھا۔

سب سے چھوٹے سوداگر بچّے نے، جس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ ہوگی، ایک بار پھر التجائیہ لہجے میں راجو سے کہا "راجو، خُدا کے لیے اندر چلی آؤ... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ پھر کبھی تمھیں نہیں ستاؤں گا... لو اب مان جاؤ.. تمھاری بغل میں وکیلوں کا مکان ہے؛ اُن میں سے کسی نے دیکھ یا سُن لیا تو بڑی بدنامی ہوگی"

راجو خاموش رہی، پھر تھوڑی دیر کے بعد بولی: "مجھے میرے کپڑے لادو... بس اب میں تمھارے گھر میں نہیں رہوں گی... تنگ آگئی ہوں... میں کل سے وکیلوں کے ہاں نوکری کر لوں گی... اب اگر تم نے مجھ سے کچھ اور کہا تو خدا کی قسم، شور مچانا شروع کر دوں گی... چپ چاپ میرے کپڑے لادو"

سوداگر بچّے نے کہا "لیکن تم رات کہاں کاٹو گی؟"

راجو نے جواب دیا "جہنّم میں.. تمھیں اس سے کیا... جاؤ، اپنی بیوی کی بغل گرم کرو، میں کہیں نہ کہیں سو جاؤں گی" راجو کی آنکھوں میں آنسو آگئے ـــــ وہ سچ مچ رو رہی تھی۔

درز پر سے آنکھ ہٹا کر وہ پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔

راجو کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اُسے عجیب قسم کا صدمہ ہوا تھا؛ اُس صدمے کے ساتھ وہ نفرت بھی لپٹی ہوئی تھی جو راجو کو اُس حالت میں دیکھ کر اُس کے دل میں پیدا ہوئی تھی ـــــ مگر غایت درجہ نرم دل ہونے کے باعث وہ پگھل سا گیا۔ راجو کی کھلاڑی آنکھوں میں، جو شیشے کے مرتبان میں چمکدار مچھلیوں کی طرح سدا متحرک رہتی تھیں، آنسو دیکھ کر اُس کا جی چاہا کہ اُنھیں تھپکا کر دلاسا دے۔

راجو کی جوانی کے چار قیمتی برس سوداگر بھائیوں نے معمولی چٹائی کی طرح استعمال کیے تھے۔ ان برسوں میں تینوں سوداگر بھائیوں کے نقشِ قدم کچھ اس طرح خلط ملط ہو گئے تھے کہ اُن میں سے کسی کو بھی اس بات کا خوف نہیں رہا تھا کہ کوئی اُن کے پیروں کے نشان پہچان لے گا۔ اور راجو کے متعلق بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ نہ اُس نے اپنے قدموں کے نشان دیکھے تھے، نہ دوسروں کے۔ راجو کو تو بس چلتے جانے کی دُھن تھی، کسی بھی طرف۔

پر اب شاید راجو نے مُڑ کے دیکھا تھا ـــــ مُڑ کے راجو نے کیا دیکھا تھا جو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ـــــ وہ نہیں جانتا تھا۔

باہر سن تیس کی آخری رات دَم توڑ رہی تھی اور اندر کمرے میں اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔

کیا راجو سوداگر بھائیوں کے مکان کے اندر چلی گئی ہے ؟
کیا وہ سب سے چھوٹے سوداگر بچّے کا کہا مان گئی ہے ؟
مگر وہ جھگڑی کس بات پر ہے ؟
ضرور اُس کے اور سوداگر بچّے کے درمیان، جس کا نام محمود ہے، کسی بات پر جھگڑا ہوا ہے — جبھی تو وہ دسمبر کی خون منجمد کر دینے والی آخری رات میں صرف ایک بنیان پہنے گھر سے باہر نکل آئی ہے اور واپس اندر جانے کا نام تک نہیں لے رہی ہے۔

وہ سوچ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ اُسے راجو کے کانپتے ہوئے نتھنے نظر آرہے ہیں۔
وہ جانتا تھا کہ راجو کو دُکھی دیکھ کر اُس کے ایک نامعلوم جذبے کو تسکین ملی ہے، لیکن اُس کے دل میں رحم کے جذبات بھی پیدا ہوئے ہیں۔
کسی عورت سے اُس نے کبھی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا تھا، شاید اسی لیے وہ راجو کو دُکھی دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اُس سے اپنی ہمدردی کا اظہار کر سکے۔
اُسے یقین تھا کہ اگر وہ راجو کے قریب ہونا چاہے گا تو وہ جنگلی گھوڑی کی طرح بدکے گی نہیں۔
راجو غلاف چڑھی عورت نہیں تھی، وہ جیسی بھی تھی، دُور سے نظر آجاتی تھی، اُس کی بھدی اور موٹی ہنسی جو اکثر اُس کے مٹ میلے ہونٹوں پر بیجوں کے ٹوٹے ہوئے گھروندے کے مانند نظر آتی تھی، اصلی ہنسی تھی — اور اب اُس کی بھنورے جیسی متحرک آنکھوں نے آنسو اُگل دیے تھے تو ان میں کوئی مصنوعی پن نہیں رہا تھا۔
راجو کو وہ، اُس کا نام جانے بنا، ایک مدّت سے جانتا تھا —— اُس کی آنکھوں کے سامنے راجو کے چہرے کے تمام خطوط تبدیل ہوئے تھے اور وہ غیر محسوس طریق پر لڑکی سے عورت بننے کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تین سوداگر بھائیوں کو ہجوم نہیں سمجھتی تھی۔
اُسے یہ ہجوم پسند نہیں تھا، اس لیے کہ وہ ایک عورت کے ساتھ صرف ایک مرد منسلک دیکھنے کا قائل تھا —— اور یوں اُسے راجو کے معاملے میں پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے درمیان رُک جانا پڑتا تھا۔

سن اکتیس کی پہلی صبح وہ آئی۔

وہ لحاف اوڑھے لیٹا ہوا تھا اور جاگ رہا تھا۔
اُس نے کمرہ صاف کیے جانے کی آواز سنی تو سمجھا کہ جمعدار جلدی آگیا ہے ـــــ اس نے لحاف کے اندر ہی سے کہا: "جمعدار، گرد مت اُڑانا۔"
ایک نسوانی آواز اُس کو سُنائی دی: "جی میں . . . جی میں تو . . ."
اُس نے لحاف اُلٹ دیا ـــــ راجو سامنے کھڑی تھی۔
وہ بہت متحیر ہوا ـــــ چند لمحات وہ راجو کو دیکھتا رہا، پھر اُس نے کہا: "تم یہاں کیسے آگئی ہو؟"
راجو نے جھاڑو اپنے کاندھے پر رکھا اور جواب دیا: "میں آج صبح ہی یہاں آئی ہوں . . سوداگروں کی نوکری میں نے چھوڑ دی ہے۔"
اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ آخر اُس نے اتنا کہا: "اچھا کیا . . . اب کیا تم نے ہمارے ہاں ملازمت اختیار کر لی ہے؟"
"جی ہاں" راجو نے مختصر سا جواب دیا۔
یکایک اُس نے محسوس کیا کہ اُس کو راجو سے سخت نفرت ہے اور اُس کو بڑی اُلجھن محسوس ہوئی۔
رات کا تماشا اُس کی آنکھوں کے سامنے تھا: "مجھے اِس سے نفرت ہے، اِس قدر نفرت کہ میں چاہتا ہوں، یہ میری نظروں کے سامنے نہ آئے . . . میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر میں اس کا کسی قسم کا دخل ہو . . ."
وہ کچھ سمجھ نہ پا رہا تھا ـــــ حالانکہ بات صرف اتنی تھی کہ اُس کی والدہ بہت رحم دل تھیں اور انھیں ایک نوکرانی کی ضرورت تھی اور انھوں نے راجو کو ملازم رکھ لیا تھا۔
راجو آتی ـــــ صبح ناشتہ لے کر آتی، پھر شیو کا سامان لے کر آتی، دوپہر کا کھانا پیش کرتی۔
اس کو راجو کی سب باتیں بہت ناگوار گزرتیں ـــــ وہ نہیں چاہتا تھا کہ راجو اُس کے لیے وہ سب کرے۔
ایک دن اُس نے تنگ آکر راجو سے کہا: "دیکھو راجو، مجھے تمھاری ہمدردیاں پسند نہیں . . میں اپنا کام خود کر سکتا ہوں . . تم مہربانی کر کے تکلیف نہ کیا کرو۔"
راجو نے بڑی متانت سے کہا: "سرکار، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی . . . میں تو آپ کی باندی ہوں۔"
وہ جھینپ سا گیا: "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے . . . تم نوکرانی ہو، بس اِس بات کا خیال رکھو۔"
راجو نے تپائی کا کپڑا ٹھیک کرتے ہوئے کہا: "جی مجھے ہر چیز کا خیال ہے . . . مجھے اِس بات کا بھی خیال ہے کہ آپ مجھے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔"
وہ اُلٹ پُلٹ گیا: "میں . . . میں تمھیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا، یہ تم نے . . . یہ تُم نے کیسے جانا؟"
راجو مسکرائی: "حضور، آپ امیر آدمی ہیں . . . آپ کو ہم غریبوں کے دکھ درد کا کوئی احساس نہیں

ہوسکتا۔"

اُس کو راجو سے اور زیادہ نفرت ہوگئی —— وہ سمجھنے لگا کہ وہ لڑکی، جو اُس کے گھر میں اُس کی والدہ کی نرم طبیعت کی وجہ سے آگئی ہے، بہت واہیات ہے۔

اور راجو تھی کہ بڑی باقاعدگی سے گھر کا کام کرتی کہ نقص نکالنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

جب اُس کی شادی کا سوال اٹھا تو وہ بہت مضطرب ہوا۔ وہ اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا —— اُس نے اپنے والدین سے صاف لفظوں میں کہہ دیا: "مجھے یہ جھنجھٹ ابھی نہیں چاہیئے۔"

اُس کے والدین نے بہت زور دیا کہ وہ شادی کرلے، مگر وہ نہ مانا —— اُسے کوئی لڑکی پسند نہیں آئی تھی۔

ایک دن وہ گھر سے غائب ہوگیا —— راجو بھی۔

دوسرے دن معلوم ہوا کہ وہ میاں بیوی بن چکے ہیں۔

فہمیدہ کی جب شادی ہوئی تو اس کی عمر بیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔

اس کا جہیز تیار تھا، اس لیے اُس کے والدین کو کوئی دقت محسوس نہ ہوئی ـــ پچیس کے قریب جوڑے تھے اور زیورات بھی، لیکن فہمیدہ نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ سُرمہ جو خاص طور پر اُن کے یہاں آتا ہے، چاندی کی سُرمے دانی میں ڈال کر اُسے ضرور دیا جائے، اور چاندی کا سُرمچو بھی۔

فہمیدہ کی خواہش فوراً پوری کر دی گئی۔

اعظم علی کی دکان سے سُرمہ منگوایا گیا اور برکت علی کی دکان سے سُرمے دانی اور سُرمچو ـــ اور فہمیدہ کے جہیز میں رکھ دیا گیا۔

فہمیدہ کو سُرمہ بہت پسند تھا۔ کیوں اتنا پسند تھا، یہ اُس کو معلوم نہیں تھا ـــ شاید اِس لیے پسند تھا کہ اُس کا رنگ بہت زیادہ گورا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ تھوڑی سی سیاہی بھی اُس کے رنگ میں شامل ہو جائے ـــ ہوش سنبھالتے ہی اُس نے سُرمے کا استعمال شروع کر دیا تھا۔

اُس کی ماں اُس سے اکثر کہتی: "فہمی، یہ تمھیں کیا خبط ہوگیا ہے . . . جب نہ تب آنکھوں میں سُرمہ لگاتی رہتی ہو۔"

فہمیدہ مُسکراتی: "امّی جان، اِس سے نظر کمزور نہیں ہوتی . . . آپ نے ویسے عینک کب لگوائی تھی؟"

"بارہ برس کی عمر میں۔"

فہمیدہ ہنستی: "اگر آپ نے سُرمے کا استعمال کیا ہوتا تو آپ کو کبھی عینک کی ضرورت محسوس نہ ہوتی... اصل میں ہم لوگ کچھ زیادہ ہی روشن خیال ہوگئے ہیں، لیکن روشنی کے بدلے ہمیں اندھیرا ہی اندھیرا ملتا ہے۔"

اُس کی ماں کہتی: "جانے کیا بکتی رہتی ہے۔"

"امّی جان، میں جو کچھ بھی بکتی رہتی ہوں، صحیح ہوتا ہے . . . آج کل لڑکیاں نقلی بھویں لگاتی ہیں، کالی پنسل سے اپنے چہرے پر، خُدا معلوم، کیا کرتی ہیں، لیکن نتیجہ کیا نکلتا ہے . . . بس چڑیل بن جاتی ہیں۔"

اُس کی ماں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا: "جانے کیا کہتی رہتی ہے . . . میری سمجھ میں تو خاک بھی نہیں آتا۔"

فہمیدہ کہتی: "آپ کو اتنا تو سمجھنا ہی چاہیے کہ دُنیا میں صرف خاک ہی خاک نہیں، کچھ اور بھی ہے۔"

اُس کی ماں اُس سے پوچھتی: "اور کیا ہے؟"

فہمیدہ جواب دیتی: "بہت کچھ ہے . . . خاک میں سونے کے ذرّے ہو سکتے ہیں۔"

خیر فہمیدہ کی شادی ہوگئی۔

میاں بیوی کی پہلی ملاقات بڑی دلچسپ تھی۔

جب اُس کا خاوند، اُس سے ہم کلام ہوا تو اُس نے دیکھا کہ فہمیدہ کی آنکھوں میں سیاہیاں تیر رہی ہیں۔

اُس کے خاوند نے پوچھا: "یہ تُم اتنا سُرمہ کیوں لگاتی ہو؟"

وہ جھینپ گئی اور جواب میں کچھ نہ کہہ سکی۔

اُس کے خاوند کو اُس کی یہ ادا پسند آئی اور وہ اُس سے لپٹ گیا۔

فہمیدہ کی سُرمہ بھری آنکھوں سے ٹپ ٹپ کالے کالے آنسو بہنے لگے۔

اُس کا خاوند پریشان ہوگیا: "تُم رو کیوں رہی ہو؟"

فہمیدہ خاموش رہی۔

اُس کے خاوند نے ایک بار پھر پوچھا: "کیا بات ہے . . . آخر رونے کی کیا وجہ ہے . . . مَیں نے تمھیں کوئی دُکھ پہنچایا؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر رونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟"

"کوئی بھی نہیں۔"

اُس کے خاوند نے اُس کے گال پر ہولے سے تھپکی دی اور کہا "جانِ من، جو بات ہے، مجھے بتا دو۔ ۔ ۔ اگر میں نے کوئی زیادتی کی ہے تو اُس کی معافی چاہتا ہوں ۔ ۔ ۔ دیکھو، تم اِس گھر کی ملکہ ہو اور میں تمھارا غلام ہوں ۔ ۔ مجھے یہ رونا دھونا اچھا نہیں لگتا ۔ ۔ ۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سدا ہنستی رہو۔"

فہمیدہ روتی رہی۔

اُس کے خاوند نے پھر پوچھا "آخر اِس رونے کی وجہ کیا ہے؟"

فہمیدہ نے جواب دیا "کوئی وجہ نہیں ہے ۔ ۔ ۔ آپ پانی کا ایک گلاس لا دیجیے مجھے۔"

اُس کا خاوند فوراً پانی کا ایک گلاس لے آیا۔

فہمیدہ نے اپنی آنکھوں میں لگا ہوا سُرمہ دھویا، تولیے سے اچھی طرح منہ صاف کیا ـــــ آنسو خود بخود خشک ہو گئے ـــــ اِس کے بعد وہ اپنے خاوند سے ہم کلام ہوئی "میں معذرت چاہتی ہوں کہ آپ کو میں نے اتنا پریشان کیا ۔ ۔ ۔ دیکھیے اب میری آنکھوں میں سُرمے کی ایک لکیر بھی باقی نہیں رہی۔"

اُس کے خاوند نے کہا "مجھے سُرمے پر کوئی اعتراض نہیں ۔ ۔ تم شوق سے استعمال کرو، مگر اتنا زیادہ نہیں کہ آنکھیں اُبلتی نظر آئیں۔"

فہمیدہ نے آنکھیں جُھکا کر کہا "مجھے آپ کا ہر حکم بجا لانا ہے ۔ ۔ ۔ آئندہ میں کبھی سُرمہ نہیں لگاؤں گی۔"

"نہیں نہیں، میں تمھیں اِس کے استعمال سے منع نہیں کرتا ۔ ۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ۔ ۔ ۔ کہ ۔ ۔ ۔ میرا مطلب ہے کہ اِس چیز کو بہ کفایت استعمال کیا جائے ۔ ۔ ضرورت سے زیادہ جو بھی چیز استعمال میں آئے گی، اپنی قدر کھو دے گی۔"

فہمیدہ نے سُرمہ لگانا چھوڑ دیا ـــــ لیکن وہ ہر روز اپنی چاندی کی سُرمے دانی اور چاندی کے سُرمچو کو نکال کر دیکھتی اور سوچتی کہ یہ دونوں اُس کی زندگی سے کیوں خارج ہو گئی ہیں، وہ کیوں اُن کو اپنی آنکھوں میں جگہ نہیں دے سکتی، صرف اِس لیے کہ اُس کی شادی ہو گئی ہے، صرف اِس لیے کہ وہ اب کسی کی ملکیت ہو گئی ہے، ہو سکتا ہے کہ اُس کی قوتِ ارادی سلب ہو گئی ہو ـــــ وہ کوئی فیصلہ نہ کر پاتی، وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکتی۔

ایک برس کے بعد اُس کے ہاں چاند سا بچہ آ گیا۔

وہ نڈھال تھی، لیکن اُسے اپنی کمزوری کا کوئی احساس نہیں تھا، اِس لیے کہ وہ اپنے لڑکے کی پیدائش پر نازاں تھی ـــ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُس نے کوئی بہت بڑی تخلیق کی ہے۔

چالیس دنوں کے بعد اُس نے سُرمہ نکالا اور اپنے نومولود لڑکے کی آنکھوں میں لگایا ـــ اُس کے

لڑکے کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ اُن میں جب سُرمے کی تحریر ہوئی تو وہ اور بھی زیادہ بڑی ہوگئیں۔

اُس کے خاوند نے کوئی اعتراض نہ کیا کہ وہ بچّے کی آنکھوں میں سُرمہ کیوں لگاتی ہے اس لیے کہ اُسے بڑی خوب صورت آنکھیں پسند تھیں۔

دن اچھی طرح گزر رہے تھے۔

فہمیدہ کے خاوند شجاعت علی کو ترقی مل گئی تھی۔ اب اُس کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار روپے کے قریب تھی۔ ایک دن شجاعت علی نے اپنے لڑکے، جس کا نام اس کی بیوی نے عاصم رکھا تھا، کی سُرمہ لگی آنکھوں میں بڑے غور کے ساتھ دیکھا ـــــ وہ اس کو بہت پیارا لگا۔ اُس نے بے اختیار اس کو اٹھایا، چوما چاٹا اور پلنگڑی پر ڈال دیا ـــــ وہ ہنس رہا تھا اور اپنے ننھے منے ہاتھ پاؤں اِدھر اُدھر مار رہا تھا۔

پھر اُس کی سالگرہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔

فہمیدہ نے ایک بہت بڑے کیک کا آرڈر دیا ـــــ محلّے کے سب بچّوں کو دعوت دی گئی وہ چاہتی تھی کہ اُس کے لڑکے کی پہلی سالگرہ بڑی شان سے منائی جائے۔

سالگرہ یقیناً شان سے منائی جاتی، مگر دو دن پہلے عاصم کی طبیعت ناساز ہوگئی اور ایسی ہوئی کہ اُسے تشنج کے دَورے پڑنے لگے۔

وہ اُسے ہسپتال لے گئے ـــــ ڈاکٹروں نے معائنہ کیا اور تشخیص کے بعد معلوم ہوا کہ اُسے ڈبل نمونیا ہو گیا ہے۔

فہمیدہ رونے لگی، سر پیٹنے لگی: "ہائے میرے لال کو یہ کیا ہوگیا... ہم نے تو اِسے پھولوں کی طرح پالا ہے۔"

ایک ڈاکٹر نے اس سے کہا: "میڈم، یہ بیماریاں انسان کے احاطۂ اختیار میں نہیں ہیں... ویسے بحیثیت ڈاکٹر میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ بچّے کے جینے کی کوئی امید نہیں۔"

فہمیدہ نے زور زور سے رونا شروع کر دیا: "میں خود مر جاؤں گی... خُدا کے لیے، ڈاکٹر صاحب اسے بچا لیجیے... آپ اسے بچا سکتے ہیں... مجھے اللہ کے گھر سے امید ہے کہ میرا بچّہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

ڈاکٹر نے بڑے خشک لہجے میں کہا: "خدا کرے، ایسا ہی ہو۔"

"آپ اتنے ناامید کیوں ہیں؟" فہمیدہ نے درد بھری آواز میں کہا۔

"میں ناامید نہیں، لیکن میں آپ کو جھوٹی تسلّی نہیں دینا چاہتا۔"

"جھوٹی تسلیاں آپ مجھ کو کیوں دیں گے... مجھے یقین ہے کہ میرا بچّہ زندہ رہے گا۔"

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔"

مگر خدا نے ایسا نہ کیا اور بچّہ تین روز کے بعد ہسپتال میں مر گیا۔

فہمیدہ پر دیر تک پاگل پن کی کیفیت طاری رہی ـــــــ اس کے ہوش و حواس گم ہو گئے تھے۔
وہ کوئلے اٹھاتی، انہیں پیستی اور پھر اپنے چہرے پر کالک ملنا شروع کر دیتی۔
شجاعت علی سخت پریشان تھا ـــــــ اس نے کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا اور فہمیدہ کو دوائیں بھی دیں،
لیکن خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔
فہمیدہ کے دل و دماغ میں سُرمہ ہی سُرمہ تھا ـــــــ وہ ہر بات کالک کے ساتھ سوچتی تھی۔
اس کا خاوند اس سے کہتا "کیا بات ہے . . . تم اتنی افسردہ کیوں رہتی ہو ؟"
وہ جواب دیتی "جی کوئی خاص بات نہیں، بس سُرمہ ختم ہو گیا ہے . . . مجھے اب سُرمہ لا دیجیے۔"
اُس کا خاوند اُس کے لیے سُرمے آیا، مگر اُس کو پسند نہ آیا۔
پھر وہ خود بازار گئی اور اپنی پسند کا سُرمہ خرید کر لے آئی۔
سُرمہ اُس نے اپنی آنکھوں میں لگایا اور سو گئی، جس طرح وہ اپنے بیٹے عاصم کے ساتھ سویا کرتی تھی۔
صبح جب اُس کا خاوند اُٹھا اور اُس نے اپنی بیوی کو جگانے کی کوشش کی تو وہ مُردہ پڑی تھی ـــــ اُس
کے پہلو میں ایک گڑیا تھی، جس کی آنکھیں سُرمے سے لبریز تھیں۔

مہتاب خان

شام کو میں گھر میں بیٹھا اپنی بچیوں سے کھیل رہا تھا کہ میرے دوست طاہر صاحب بڑی افراتفری میں آئے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی آپ نے مینٹل پیس پر سے میرا فاؤنٹین پین اٹھا کر میرے ہاتھ میں تھمایا اور کہا: "ہسپتال کے کسی ڈاکٹر کے نام چٹ لکھ دیجیے۔"

مجھے کچھ پوچھنے کی فرصت بھی نہ دی گئی ——— میں نے ایک ڈاکٹر کے نام رقعہ لکھنا شروع کر دیا۔

مضمون طاہر صاحب نے لکھوایا، جس کا مطلب یہ تھا کہ حاملِ رقعہ خطرناک طور پر علیل ہے، اس لیے اسے فوراً ہسپتال میں داخل کر لیا جائے۔

مجھ سے جو کہو ایا گیا، میں نے لکھ دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد طاہر صاحب پھر تشریف لائے۔

مجھے تشویش تھی کہ جس مریض کی میں نے سفارش کی تھی، وہ ہسپتال میں داخل ہو سکا ہے یا نہیں۔

لیکن وہ بڑے مطمئن تھے ــــــ میرے دریافت کرنے پر انھوں نے کہا: "جہنم میں جائیے . . . میں نے آپ کی چٹ اُس کے لواحقین کو دے دی ہے۔"

یہ سُن کر میں خاموش ہوگیا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد میں نے ان سے پوچھا: "یہ مہتاب خاں کون ہیں جن کو ہسپتال میں داخل کرانے کے لیے آپ اتنے بیتاب تھے؟"

طاہر صاحب مسکرائے: "اوّل درجے کا حرامی ہے۔"

اگر مہتاب خاں تیسرے درجے کا حرامی بھی ہوتا تو کیا فرق پڑتا، لیکن مجھے اُس سے فوراً دلچسپی پیدا ہوگئی، چنانچہ میں نے طاہر صاحب سے پوچھا: "اُسے عارضہ کیا ہے؟"

انھوں نے جواب دیا: "عشق!"

اس کے بعد انھوں نے خلافِ معمول باتونی ہو کر مہتاب خاں کے عشق کی داستان بیان کرنا شروع کردی۔

آپ نے بتایا کہ مہتاب خاں کی عمر اٹھارہ انیس برس کے قریب ہے جیسا کہ اُس کا نام ظاہر کرتا ہے وہ پٹھان ہے، کافی ہٹا کٹا۔ مگر اُس کی دونوں آنکھوں میں رسا لگا ہوا ہے ــــ چوبرجی کے قریب اُس کے بڑے بھائی کی چائے کی دکان ہے، جہاں اُس سے کام لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

طاہر صاحب نے اُس نوجوان کے متعلق مزید تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہا: "منٹو صاحب، یہ شخص عجیب و غریب ہے . . . مزاج اس قدر عاشقانہ ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا . . . ہر وقت اپنے بھائی کے چولہے میں پنکھے سے کوئلے سلگاتا رہتا ہے، مگر بازار میں ہر آنے جانے والی لڑکی کو ایسی نظروں سے دیکھتا ہے، جیسے وہ اُس پر اگر اُسی وقت نہیں تو تھوڑے عرصے میں ضرور عاشق ہوجائے گی اور یہ بہت ممکن ہے۔ وہ اُس کے عشق میں گھر جا کر خودکشی بھی کرلے . . ."

اس تمہید کے بعد طاہر صاحب نے مجھے بتایا کہ مہتاب خاں ہوٹل سے باہر لوگوں کے لیے چائے لے جایا کرتا تھا ــــ ایک دن اُسے اسکول کی ایک استانی نے، جو فزکل انسٹرکٹرس تھی اور ہوٹل کے پاس ہی رہتی تھی، چائے کی ٹرے لانے کے لیے کہا ــــ اُس کے ہاں پہنچتے ہی وہ اُس لڑکی پر عاشق ہوگیا۔

لیکن مہتاب خاں کا بیان جُدا ہے ــــ اُس نے طاہر صاحب اور ان کے دوستوں سے ٹھیٹ پٹھانی لہجے میں کہا تھا: "خو، وہ زن جو اسکول میں پڑھاتی ہے، مجھے دیکھتے ہی گرم ہوگئی . . . خوام خوبرو ہے، جوان ہے . . . دیکھو اب کیا ہوتا ہے . . . جان کے لالے پڑ جائیں گے۔"

مہتاب خاں کی جان کے لالے پڑے ہیں ــــ وہ یوں کہ اس نے اپنے بھائی کے ہوٹل کے گلے سے پچاس روپے اُڑا لیے اور کسی اور ہوٹل میں بڑے ٹھاٹ سے بیٹھ کر اپنے دوستوں کو یہ بات سنائی: "مس مراد دیہ اُس لڑکی کا نام ہے، بہت بڑی پیلے رنگ کی موٹر میں انارکلی سے گذر رہی تھی اور وہ ایک دکان پر کھڑا انسوار لے

رہا تھا کہ مس مراد نے عین اُس کے قریب اپنی موٹر رکوائی، پھر باہر نکل کر سر بازار اُس سے ہاتھ ملایا اور اپنے پرس سے پچاس روپے کے نوٹ نکال کر اُس کو دیے اور یہ جا، وہ جا ۔۔۔ مہتاب خاں کا بیان تھا کہ جب مس مراد نے اُس سے ہاتھ ملایا تھا اُس وقت وہ محبت کے شدید جذبے سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

اُسی رات جب مہتاب خاں چوری کے پچاس روپے کچھ تو ہوٹلوں میں اور باقی کے ہیرامنڈی میں خرچ کر چکا تھا۔ اُس کے بڑے بھائی نے جانے کس جگہ اُس کی گردن ناپی اور ایسے زور سے ناپی کہ وہ دو دن تک بلبلاتا رہا، لیکن اُس نے کسی پر یہ ظاہر نہ کیا حالانکہ حقیقت کا علم ہر آنے جانے والے کو تھا کہ اُس نے روپے چُرائے تھے ـــــ وہ ہر یہی کہتا رہا کہ اُس کی جوانی اور اُس کے حُسن سے متاثر ہو کر مس مراد اُسے روپے دیتی رہتی ہے۔

دوسری مرتبہ اُس نے ساتھ والے دکاندار کے سو روپے چرائے اور انارکلی کے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر اپنے دوستوں سے کہا کہ مس مراد نے اُسے یہ رقم عیش کرنے کے لیے دی ہے ـــــ مہتاب خاں کے دوست بہت مرعوب ہوئے، لیکن وہ دوسرے ہی روز پکڑا گیا اور چند روز حوالات میں رہا ـــــ مقدمہ چلا چونکہ ثبوت کوئی نہ تھا، اِس لیے بری ہو گیا۔

اِس حادثے کے بعد اُس کا مس مراد سے عشق اور زیادہ بڑھ گیا۔ بلکہ یوں کہیے کہ اب وہ اپنی روایتی عاشقانہ بے اعتنائی ترک کر کے مس مراد کو ہر وقت یاد کرنے لگا ـــــ چولہا سلگاتے وقت، یا صبح کو جھاڑو دیتے وقت وہ مس مراد کا نام لیتا! "خوش مس مراد، تو ہی ہماری مراد پوری کرے گی"

اب اُس نے روپے پیسے کا سرقہ بند کر دیا، لیکن مکھن کی چوری شروع کر دی۔ ہر روز وہ اپنے بھائی کے ہوٹل سے کم از کم مکھن کی دو ٹکیاں اُڑا لیتا۔ آس پاس کے جو اور ہوٹل تھے، اُن سے بھی وہ صرف مکھن چراتا اور کھاتا ـــــ ہر روز اِس قدر مکھن کھانے کا یہ اثر ہوا کہ مہتاب خاں اچھا خاصا ڈیری فارم بن گیا۔

اُس کے بدن سے، اُس کے مُنہ سے، اُس کے لباس سے مکھن کی بُو آنے لگی ـــــ وہ اپنی صحت بنا رہا تھا ـــــ اُس کا کہنا تھا کہ عورت صحت اور جوانی پر مرتی ہے ـــــ لیکن طاہر صاحب کا کہنا ہے کہ ہر مکھن چور فرشتہ نہیں ہو سکتا ـــــ مہتاب خاں کی آنکھیں ویسی کی ویسی بند تھیں۔

اب کچھ مس مراد کے متعلق سُن لیجیے۔

طاہر صاحب نے جب مس مراد کے حدود اربعے کے متعلق اِدھر اُدھر پوچھ گچھ کی تو انھیں معلوم ہوا کہ مس مراد کی ماں جنگلی ہے اور ابھی تک کوٹھے کماتی ہے، دوسرے الفاظ میں لوگوں کا بول و براز اٹھاتی ہے۔ چونکہ وہ اور اُس کا خاوند عیسائی ہو گئے تھے، اِس لیے اُن کی لڑکی مس مراد نے تھوڑی سی تعلیم حاصل کی اور ایک اسکول میں فزیکل انسٹرکٹرس ہو گئی ـــــ مس مراد خوش شکل تھی، اِس لیے اُس کے کئی چاہنے والے پیدا ہو گئے جو اُس کی تمام آسائشوں کا خیال رکھتے تھے۔

مہتاب خاں اُس کے عشق میں بُری طرح گرفتار تھا ـــــ وہ ہوٹل میں کوئلے جلاتا اور آہیں بھرتا ـــــ

اس کے باوجود جب وہ اپنے یار دوستوں سے باتیں کرتا تو بڑے فخر سے اس بات کا اعلان کرتا کہ مس مراد اُس پر بہت بُری طرح مرتی ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں، حقیقت اس کے برعکس تھی —— مس مراد، جو بے شمار عاشقوں کے درمیان گھری رہتی تھی، کو مہتاب خاں کی موجودگی کا علم ہی کیا ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اُس بیچارے کی حقیقت ہی کیا تھی۔

ایک دن مہتاب خاں چائے کی ٹرے لے کر مس مراد کے یہاں گیا —— جس جگہ وہ رہتی تھی، وہاں چھوٹا سا ایک باغ تھا۔ اُس باغ میں لوکاٹ کے بُوٹے تھے —— مہتاب خاں کو یہ پھل بے حد پسند تھا معلوم نہیں کیوں —— جب وہ ٹرے لے کر اندر گیا تو وہاں مس مراد کے دوست احباب بیٹھے لوکاٹیں کھا رہے تھے —— مس مراد نے مہتاب خاں کو لوکاٹوں کے چار پانچ دانے شاید اس لیے دے دیے کہ موسم کا پہلا میوہ تھا —— وہ بہت خوش ہوا۔

جب وہ واپس ہوٹل آیا تو اُس کا بڑا بھائی بھی لوکاٹیں کھا رہا تھا، جو مس مراد کی دی ہوئی لوکاٹوں کے مقابلے میں زیادہ بڑی اور رسیلی تھیں، لیکن وہ یہ ماننے سے مُنکر تھا —— اُس کی بڑے بھائی سے قریب قریب جنگ ہوگئی۔

اُس کے بڑے بھائی نے تاؤ میں آکر کہا: "اگر تمھیں اپنی مس مراد کی لوکاٹیں پسند ہیں، اور جیسا کہ تم کہتے ہو، وہ تم پر مرتی ہے تو جاؤ اور ایک بُوٹا وہاں سے لے آؤ اور ہوٹل کے سامنے لگا دو۔"

رات بھر مہتاب خاں غائب رہا۔

اس کے دوستوں کا خیال تھا کہ اُسے مس مراد نے بُلا لیا ہوگا، یا پھر اُس کے بیے پچاس روپے بھیج دیے ہوں گے اور وہ کہیں عیاشی کر رہا ہوگا —— مگر صبح سڑک پر آنے جانے والے یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ اُس کے بھائی کے ہوٹل کے ساتھ جہاں ایک گڑھا ہوا کرتا تھا، وہاں لوکاٹ کا ایک درخت لگا ہوا ہے۔

وہ درخت مہتاب خاں نے رات رات میں وہاں سے، جہاں مس مراد رہتی تھی، اکھاڑا تھا —— معلوم نہیں، کتنی مشقت کرنی پڑی ہوگی اُسے —— مگر اپنے دوستوں سے اُس نے یہی کہا کہ مس مراد نے اُسے وہ بُوٹا خود اپنے ہاتھوں سے عنایت کیا ہے، اِس لیے کہ مس مراد اُس پر سو جان سے فریفتہ ہے۔

وہ بوٹا چند دنوں کے اندر اندر مرجھا گیا، لیکن اُس کا چرچا کافی دیر تک رہا۔

طاہر صاحب کا یہ کہنا ہے کہ وہ مہتاب خاں کے اِس مدارک پنے سے خاصے متاثر ہوئے تھے لیکن جب انھوں نے اپنی روایتی ظلم پسندی سے کام لیتے ہوئے مہتاب خاں سے کہا تھا: "تم بکواس کرتے ہو... ذرا آئینے میں اپنی شکل دیکھو... مس مراد تو کیا، تمھیں ایک گھیائی بھی کبھی منہ نہیں لگا سکتی..." تو مہتاب خاں نے اپنا مکھن کھایا ہوا سینہ تان کر جواب دیا تھا: "خو تم کیسا بات کرتا ہے... خو تم نے وہ فلم نہیں دیکھا... 'پرچھائیں' نہیں 'پرچھائیں'... خو اُس میں ایک خوب صورت لڑکی ایک اندھے سے محبت کرتی ہے..."

ام انا رھا نہیں ہے۔ ۔ ۔ آنکھیں تھوڑی سی خراب ہیں، پر اس سے کیا ہوا ۔ ۔ ۔ مس مراد ام سے محبت کرتا ہے ۔ ۔ ۔"

جیسا کہ طاہر صاحب کا کہنا ہے ۔ یار لوگوں کی مہربانی یا نامہربانی سے مس مراد تک آخر یہ بات پہنچ گئی کہ مہتاب خاں جس کی آنکھیں بھولے ہیں، اس سے بے پناہ عشق کر رہا ہے ——— اس کا ردِ عمل خلافِ توقع یہ ہوا کہ وہ اپنا مکان چھوڑ کر کہیں اور چلی گئی، اس لیے کہ وہ نہیں چاہتی تھی، اس کے دوسرے چاہنے والے، جو مہتاب خاں کے مقابلے میں آنکھوں کے نہیں، عقل کے اندھے تھے، اس کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیں۔

جب مہتاب خاں کو معلوم ہوا کہ مس مراد چلی گئی ہے تو اس کو اس قدر صدمہ ہوا کہ اس روز اس نے ہوٹل میں جتنی مکھن کی ٹکیاں موجود تھیں، سب کی سب کھا لیں۔

اس کے بعد اس کا جب اور بڑھا تو مکھن کھانے کی مقدار بڑھ گئی ——— نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس کی توند بڑھ گئی ——— وہ بڑا کاہل ہو گیا ——— چولہے میں کوئلے سلگاتے سلگاتے وہ اونگھنے لگتا۔ بعض اوقات ایسی باتیں کرنا شروع کر دیتا کہ لوگوں کو یہ احساس ہوتا، وہ ماؤف الدماغ ہو گیا ہے۔

طاہر صاحب کا یہ کہنا ہے کہ اُسے ہوا ہوایا کچھ بھی نہیں تھا۔ کشمیریوں کی زبان میں وہ محض "ڈرام" لگاتا تھا۔

جب کچھ دن گزرے تو اس نے شعر کہنے شروع کر دیے ——— وہ شعر اس کی اپنی تخلیق نہیں ہوتے تھے۔ بس وہ ادھر اُدھر سے فلمی گانوں کے بول توڑ مروڑ کر گنگنا دیتا کہ سننے والوں پر یہ واضح ہو جائے کہ وہ جذب کی حالت تک پہنچ چکا ہے، یا بہت جلد پہنچنے والا ہے۔

اس کا ایک شعر، جو طاہر صاحب کو یاد تھا، انہوں نے مجھے سنایا:

دو دِ موں کو یہ دُنیا جینے ہی نہیں دیتی
میری پھٹی شلوار کو سینے ہی نہیں دیتی

اُس کی شلوار، جو کافی گھیرے دار تھی، یوں تو ہمیشہ پھٹی رہتی تھی، پر جب سے اُس کی مس مراد آنکھوں سے اوجھل ہوئی تھی، بالکل لیر لیر ہو گئی تھی ——— لیکن اُس کی مکھن خوری دن بدن بڑھتی گئی اور اس کا چہرہ اور زیادہ سُرخ ہو گیا تھا۔

ایک دن طاہر صاحب نے مہتاب خاں سے کہا: "تمھاری رگوں میں اتنا خون جمع ہو گیا ہے، کیوں نہیں چند اونس بلڈ بنک میں دے آتے۔"

وہ فوراً مان گیا۔

ڈاکٹروں نے اُس کا خون لیا جو بڑا صحت مند تھا ـــــ اس کے بعد وہ ایک مرتبہ اور ہسپتال گیا ـــــ اس کا خون لینے کے لیے سب ڈاکٹر ہر وقت تیار تھے۔

ایک مرتبہ اُسے خاص طور پر بلایا گیا کہ اس کے تازہ تازہ خون کی ضرورت تھی۔

جب وہ ہسپتال پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ ایک مریض کے لیے اس کے خون کی ضرورت ہے ـــــ اُسے کوئی عذر نہیں تھا۔

جب اُسے فی میل وارڈ میں لے جایا گیا اور اُس کا خون مریض کے اندر داخل کرنے کا اہتمام کیا گیا تو اس نے برابر کے بستر پر دیکھا کہ مس مراد نیم بیہوشی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔

مہتاب خاں کو محسوس ہوا کہ شاید اُسے چائے منگوانے کے لیے بلایا گیا ہے۔

اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے بستر پر لٹایا گیا اور اُس کے خون کے کئی اونس مس مراد کے جسم میں داخل کیے گئے۔

چند لمحوں کے بعد وہ کسی قسم کی نقاہت محسوس کیے بغیر اٹھا اور کہنے لگا "خو یہ ہمارا بہن ہے ... ہم چلا۔"

شاہ دولے کا چوہا

سلیمہ کی جب شادی ہوئی تو وہ اکیس برس کی تھی۔
پانچ برس ہوگئے مگر اُس کے اولاد نہ ہوئی ـــــ اُس کی ماں اور ساس کو بہت فکر تھی۔ ماں کو زیادہ تھی، اس لیے وہ سوچتی، کہیں سلیمہ کا خاوند نجیب دوسری شادی نہ کرلے۔ چنانچہ کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا مگر کوئی بات پیدا نہ ہوئی۔
سلیمہ خود بہت متفکر تھی ـــــ شادی کے بعد بہت کم لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں جو اولاد کی خواہش مند نہ ہوں ـــــ اُس نے اپنی ماں سے کئی بار مشورہ کیا اور ماں کی ہدایتوں پر بھی عمل کیا مگر نتیجہ صفر نکلا۔
ایک دن سلیمہ کی ایک سہیلی، جو بانجھ قرار دے دی گئی تھی، بہت عرصے کے بعد اُس کے پاس آئی ـــــ۔ سلیمہ کو بڑی حیرت ہوئی کہ اُس کی سہیلی کی گود میں ایک گل گوتھنا لڑکا ہے۔
اُس نے بڑے بھینڈے انداز میں پوچھا: "فاطمہ، تمھارے یہ لڑکا کیسے پیدا ہوگیا؟"
فاطمہ اُس سے پانچ سال بڑی تھی ـــــ اُس نے مسکرا کر کہا: "یہ شاہ دولے صاحب کی برکت ہے۔۔۔

مجھ سے ایک عورت نے کہا تھا: 'اگر اولاد چاہتی ہو تو گجرات جاکر شاہ دولے کے مزار پر منّت مانو اور کہو کہ حضور، جو پہلا بچہ پیدا ہوگا، وہ آپ کی خانقاہ پر چڑھاوے کے طور پر چڑھا دیا جائے گا۔ ۔ ۔'"

فاطمہ نے سلیمہ کو یہ بھی بتایا کہ جب شاہ دولے صاحب کے مزار پر ایسی منّت مانی جاتی ہے تو پہلا بچہ ایسا پیدا ہوتا ہے جس کا سر بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے اور وہ پہلا بچہ اُس خانقاہ میں چھوڑ آنا پڑتا ہے۔

سلیمہ کو فاطمہ کی بات پسند نہ آئی اور اُس کو دُکھ بھی ہوا ـــــ اُس نے سوچا: "کون ایسی ماں ہے جو اپنے بچے سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوجائے گی، اُس کا سر چھوٹا ہو، یا ناک چپٹی ہو، یا آنکھیں بھینگی ہوں ۔ ۔ ۔ ماں اپنے بچے کو گھُورے میں نہیں پھینک سکتی ۔ ۔ ۔ ایسا تو کوئی ڈائن ہی کرسکتی ہے ۔ ۔ ۔!"

لیکن اُسے اولاد چاہیے تھی، اِس لیے وہ اپنی عمر سے بڑی سہیلی کی بات مان گئی، جو گجرات کی رہنے والی تھی اور جہاں شاہ دولے کا مزار تھا۔

سلیمہ نے اپنے خاوند سے کہا: "فاطمہ مجھے مجبُور کر رہی ہے کہ اُس کے ساتھ چلوں ۔ ۔ ۔ آپ اجازت دے دیجیے۔"

اُس کے خاوند کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا ـــــ اُس نے کہا: "جاؤ، مگر جلد لوٹ آنا۔"

آخر سلیمہ ایک دن فاطمہ کے ساتھ گجرات چلی گئی۔

شاہ دولے کا مزار، جیسا کہ اُس نے سوچ رکھا تھا، کوئی عہدِ عتیق کی عمارت نہیں تھی ـــــ اچھی خاصی جگہ تھی جو اُس کو پسند آئی، مگر جب اُس نے ایک حجرے میں شاہ دولے کے چوہے دیکھے، جن کی ناک سے رینٹھ بہہ رہا تھا اور جن کا دماغ بالکل ماؤف تھا تو وہ کانپ کانپ گئی۔

وہاں اُس نے ایک جوان لڑکی دیکھی ـــــ پُورے شباب پر ـــــ جو ایسی حرکتیں کر رہی تھی کہ سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی کو بھی ہنسی آجاتی ـــــ وہ اُس لڑکی کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ہنسی، مگر دوسرے لمحے ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

وہ سوچنے لگی: "اِس لڑکی کا کیا ہوگا ۔ ۔ ۔ یہاں کے مجاور اِسے کسی کے پاس بیچ دیں گے جو اِسے بندریا بنا کر شہر بہ شہر پھرائیں گے ۔ ۔ ۔ یہ غریب اُن کی روزی کا ٹھیکرا بن جائے گی۔

اُس لڑکی کا سر بہت چھوٹا تھا۔

سلیمہ نے سوچا: "اگر سر چھوٹا ہے تو انسان کی فطرت تو اتنی چھوٹی نہیں ۔ ۔ ۔ وہ تو پاگلوں کے ساتھ بھی چمٹی رہتی ہے۔"

اُس شاہ دولے کی چُوہیا کا جسم بہت خوب صُورت تھا۔ اُس جسم کی ہر قوس اپنی جگہ پر مناسب و موزوں تھی، مگر اُس کی حرکات ایسی تھیں جیسے اُس کے حواس کسی خاص غرض کے ماتحت مختل کر دیے گئے ہوں۔ وہ اِس طریقے سے چلتی پھرتی اور ہنستی تھی جیسے وہ کوئی کوک بھرا کھلونا ہو۔

سلیمہ نے محسوس کیا کہ وہ اِسی غرض کے لیے بنائی گئی ہے۔

ان تمام احساسات کے باوجود اُس نے اپنی سہیلی فاطمہ کے کہنے پر شاہ دولے صاحب کے مزار پر منّت مانگی کہ اگر اُس کے بچّہ ہوا تو وہ اُن کی نذر کر دے گی۔

ڈاکٹری علاج سلیمہ نے جاری رکھا ــــــ دو ماہ کے بعد بچّے کی پیدائش کے آثار پیدا ہو گئے۔

وہ بہت خوش ہوئی ــــــ مقررہ وقت پر اُس کے لڑکا ہوا۔

حمل کے دَوران میں چونکہ چاند گرہن لگا تھا، اِس لیے لڑکے کے داہنے گال پر ایک چھوٹا سا دھبہ تھا جو بُرا نہیں لگتا تھا۔

فاطمہ نے آتے ہی کہا کہ اُس بچّے کو فوراً شاہ دولے صاحب کے حوالے کر دینا چاہیے۔

سلیمہ نے خود یہی منّت مانی تھی ــــــ کئی دنوں تک وہ ٹال مٹول کرتی رہی ــــــ اُس کی ممتا نہیں مانتی تھی کہ وہ اپنا لختِ جگر وہاں پھینک آئے۔

اُس سے کہا گیا تھا کہ شاہ دولے صاحب سے جو اولاد مانگتا ہے، اُس کے پہلے بچّے کا سر چھوٹا ہوتا ہے اُس کے لڑکے کا سر کافی بڑا تھا۔

فاطمہ نے کہا: "یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو تم بہانے کے طور پر استعمال کر سکو۔۔۔ تمہارا یہ پہلا بچّہ شاہ دولے صاحب کی ملکیت ہے اور اِس پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔۔۔ اگر تم اپنے وعدے سے پھر گئیں تو تم پر ایسا عذاب نازل ہوگا کہ ساری عمر یاد رکھو گی۔"

سلیمہ ڈر گئی۔

بادلِ ناخواستہ اُس کو اپنا پیارا گُل گوتھنا سا بیٹا، جس کے داہنے گال پر ایک چھوٹا سا دھبہ تھا گجرات جا کر شاہ دولے صاحب کے مزار کے مجاوروں کے حوالے کرنا پڑا۔

وہ اس قدر روئی، اُس کو اتنا صدمہ ہوا کہ وہ بیمار ہو گئی اور ایک برس تک زندگی اور موت کے درمیان معلّق رہی ــــــ اُس کو اپنا بچّہ بھولتا ہی نہیں تھا، خاص طور پر اُس کے داہنے گال کا چھوٹا سا دھبہ جس کو وہ اکثر چُوما کرتی تھی کہ اُس کو بہت اچھا لگتا تھا ــــــ اُس نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے بچّے کو فراموش نہ کیا۔

وہ عجیب عجیب خواب دیکھتی ــــــ شاہ دولے کا چھوٹے سر والا چوہا اُس کے پریشان تصوّر میں ایک بہت بڑا چوہا بن کر نمودار ہوتا جو اُس کے گوشت کو اپنے تیز دانتوں سے کترتا ــــــ وہ چیختی اور اپنے خاوند سے کہتی: "مجھے بچائیے۔۔۔ دیکھیے چوہا میرا گوشت کھا رہا ہے۔"

کبھی اُس کا مضطرب دماغ یہ سوچتا کہ اُس کا بچّہ چوہا بِل کے اندر داخل ہو رہا ہے۔ وہ اُس کی دُم کھینچ رہی ہے، مگر بِل کے اندر کے بڑے چوہوں نے اُس کی تھوتھنی پکڑی ہے، اِس لیے وہ اُسے باہر نہیں نکال سکتی۔

کبھی اُس کی نظروں کے سامنے وہ لڑکی آجاتی جو پُورے شباب پر تھی اور جس کو اُس نے شاہ دولے صاحب

کے مزار کے ایک حجرے میں دیکھا تھا ـــــ وہ ہنسنا شروع کر دیتی، لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد رونے لگتی، اتنا روتی کہ اُس کے خاوند کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ اُس کے آنسو کیسے خشک کرے۔
سلیمہ کو ہر جگہ چوہے نظر آتے تھے ــــ بستر پر، باورچی خانے میں، غسل خانے کے اندر، صُوفے پر، دل میں، کانوں میں ـــــ بعض اوقات تو وہ یہ محسوس کرتی کہ وہ خود ایک چوہیا ہے، اُس کی ناک سے رینٹھ بہہ رہا ہے اور وہ شاہ دولے کے مزار کے ایک حجرے میں اپنا چھوٹا، بہت ہی چھوٹا سر اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھائے ایسی حرکات کر رہی ہے کہ دیکھنے والے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں۔
اُس کی حالت قابلِ رحم تھی۔
اُس کو فضا میں دھبّے ہی دھبّے نظر آتے، جیسے ایک بہت بڑا گال ہے، جس پر سُورج بجھ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کے جگہ جگہ جم گیا ہے۔
سلیمہ کا بخار ہلکا ہوا تو اُس کی طبیعت کسی قدر سنبھل گئی۔

نجیب قدرے مطمئن ہو گیا ـــــ اُس کو معلوم تھا کہ اُس کی بیوی کی علالت کا باعث کیا ہے۔ وہ ضعیف الاعتقاد تھا۔ اُس کو اپنی پہلی اولاد کے بھینٹ چڑھانے کا کوئی احساس نہیں تھا۔ جو کچھ کیا گیا تھا، وہ اُسے بالکل مناسب سمجھتا تھا، بلکہ وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ اُس کے جو بیٹا ہوا تھا، وہ اُس کا نہیں شاہ دولے صاحب کا تھا۔
جب سلیمہ کا بخار بالکل اُتر گیا اور اُس کے دل و دماغ کا طوفان ٹھنڈا پڑ گیا تو نجیب نے اُس سے کہا:
"میری جان، اپنے بچے کو بھول جاؤ۔ ۔ ۔ وہ صدقے کا تھا"
سلیمہ نے بڑے زخم خوردہ لہجے میں کہا: "میں نہیں مانتی ۔ ۔ ۔ ساری عمر میں اپنی ممتا پر لعنتیں بھیجتی رہوں گی کہ میں نے اتنا بڑا گناہ کیوں کیا ۔ ۔ میں نے اپنا لختِ جگر اُس مزار کے مجاوروں کے حوالے کیوں کیا ۔ ۔ ۔ وہ مجاور ماں تو نہیں ہو سکتے"

ایک دن وہ غائب ہو گئی اور سیدھی گجرات جا پہنچی۔
وہ سات آٹھ روز تک وہاں رہی ـــــ اُس نے اپنے بچے کے متعلق بہت پُوچھ گچھ کی مگر کوئی اَتا پتا نہ ملا۔
وہ مایوس ہو کر واپس آ گئی اور اُس نے اپنے خاوند سے کہا: "میں اب اپنے بچے کو یاد نہیں کروں گی"
یاد تو وہ کرتی رہی، لیکن دل ہی دل میں ـــــ اُس کے بچے کے داہنے گال کا چھوٹا سا دھبہ اُس کے دل کا داغ بن کے رہ گیا تھا۔

ایک برس کے بعد اس کے لڑکی ہوئی ——— لڑکی کی شکل اُس کے پہلوٹھی کے لڑکے سے بہت ملتی جلتی تھی لیکن اُس کے داہنے گال پر داغ نہیں تھا۔

اُس نے لڑکی کا نام مجیبہ رکھا، کیونکہ اُس نے اپنے بیٹے کا نام مجیب سوچا تھا۔

جب اُس کی لڑکی دو مہینے کی ہوئی تو اس نے اُسے گود میں اُٹھایا اور سُرمے دانی سے تھوڑا سا سُرمہ نکال کر اُس کے داہنے گال پر ایک بڑا سا تل بنا دیا اور اپنے بیٹے کو یاد کر کے رونے لگی ——— اُس کے آنسو بچی کے گالوں پر گرے تو اس نے فوراً اپنے دوپٹے سے پونچھے اور ہنسنے لگی ——— وہ کوشش کرتی تھی کہ اپنا صدمہ بھول جائے۔

اس کے بعد سلیمہ کے دو لڑکے پیدا ہوئے ——— اُس کا خاوند بہت خوش تھا ——— کئی برس بیت گئے۔

ایک بار سلیمہ کو کسی سہیلی کی شادی کے موقعہ پر گجرات جانا پڑا تو اُس نے ایک بار پھر اپنے بیٹے کے متعلق پُوچھ گچھ کی مگر اُسے ناکامی ہوئی۔

اس نے سوچا کہ شاید مر گیا ہو ——— اُس نے جمعرات کو بڑے اہتمام سے فاتحہ خوانی کرائی۔

اڑوس پڑوس کی سب عورتیں حیران تھیں کہ کس مرگ کے سلسلے میں اتنا تکلف کیا گیا ہے ——— بعض نے سلیمہ سے پُوچھا، مگر اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

شام کو اُس نے اپنی دس برس کی لڑکی مجیبہ کا ہاتھ پکڑا اور اُسے اندر کمرے میں لے گئی۔ پھر اُس نے سُرمے سے مجیبہ کے داہنے گال پر ایک چھوٹا سا دھبّہ بنایا اور اُس کو دیر تک چومتی رہی۔

وہ مجیبہ ہی کو اپنا گمشدہ بیٹا سمجھتی تھی ——— اب اُس نے اپنے بیٹے کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا تھا، اس لیے کہ فاتحہ خوانی کرانے کے بعد اُس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا ——— اُس نے اپنے تصور میں اُس کی قبر بنالی تھی جس پر وہ تصور ہی میں پھول بھی چڑھایا کرتی۔

اُس کے تینوں بچے اسکول میں پڑھ رہے تھے ——— وہ ہر صبح اُن کو تیار کرتی، اُن کے لیے ناشتہ بنواتی، ہر ایک کو بناتی سنوارتی ——— جب وہ اسکول چلے جاتے تو ایک لمحے کے لیے اُسے اپنے بڑے بیٹے کا خیال آتا۔ حالانکہ وہ سوچتی کہ وہ اُس کی فاتحہ خوانی کرا چکی ہے اور اُس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو چکا ہے، پھر بھی اُس کو کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ اُس کے بیٹے کے داہنے گال کا چھوٹا سا دھبّہ اُس کے دماغ میں موجود ہے۔

ایک دن اُس کے تینوں بچے بھاگے بھاگے آئے اور اُس سے کہنے لگے "امّی، ہم تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔"

اُس نے بڑی شفقت سے پوچھا "کیسا تماشا؟"

اُس کی لڑکی مجیبہ نے، جو سب میں بڑی تھی، کہا "امّی جان، ایک آدمی ہے . . . وہ تماشا دکھاتا ہے "

اُس نے کہا "جاؤ، اُس آدمی کو بُلا لاؤ۔ مگر وہ گھر کے اندر نہ آئے، بس باہر ہی تماشہ کرے"
بچّے بھاگے ہوئے گئے اور اُس آدمی کو بلا لائے اور پھر تماشا دیکھتے رہے۔
جب تماشا ختم ہو گیا تو مجیبہ اپنی ماں کے پاس گئی کہ پیسے لے آئے۔

سلیمہ نے اپنے پرس سے چونی نکالی اور باہر برآمدے کی طرف بڑھی ——— جب وہ دروازے کے پاس پہنچی تو اُس نے دیکھا کہ شاہ دولے کا ایک چوہا کھڑا عجیب احمقانہ انداز میں سر ہلا رہا ہے ——— اُس کو ہنسی آ گئی۔

دس بارہ بچّے اُس شاہ دولے کے چوہے کے ارد گرد جمع تھے اور بے تحاشہ ہنس رہے تھے۔ اتنا شور مچ رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔
سلیمہ چونی ہاتھ میں لیے آگے بڑھی اور اُس نے شاہ دولے کے چوہے کو دینا چاہی۔ مگر اس کا ہاتھ اپنے آپ ایک دم پیچھے ہٹ گیا جیسے اسے بجلی کا کرنٹ چھو گیا ہو۔
اُس چوہے کے داہنے گال پر چھوٹا سا ایک داغ تھا۔
سلیمہ نے غور سے اُس کی طرف دیکھا ... اُس کی ناک سے رینٹھ بہہ رہا تھا۔
مجیبہ نے، جو سلیمہ کے پاس کھڑی تھی، اپنی ماں سے کہا "یہ . . . یہ چوہا . . . امّی جان، اس کی شکل مجھ سے کیوں ملتی ہے . . . ؟ میں بھی کیا چوہیا ہوں؟"
[illegible] گئی۔
دروازہ بند کر کے سلیمہ نے اُس کو چوما۔ اُس کی بلائیں لیں۔
وہ اُس کا عجیب و غریب احمقانہ حرکتیں کر رہا تھا کہ اس کے غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے دل میں بھی ہنسی کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔
اُس نے کہا "بیٹے، میں تیری ماں ہوں . . ."
شاہ دولے کا چوہا بڑے بے ہنگم طور پر ہنسا [illegible] اپنی ناک کی رینٹھ آستین سے پونچھ کر اس نے سلیمہ کے سامنے ہاتھ پھیلایا "ایک پیسہ . . ."

سلیمہ نے اپنا پرس کھولا ——— اس کی آنکھیں اپنی سات برس ہوئے کھوئے ہوئے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں ——— منٹو

روپے کا ایک نوٹ نکالا اور باہر جا کر اُس آدمی کو دینے کی کوشش کی جو اُس کے مجیب کو تماشہ بنائے ہوئے تھا۔

اُس آدمی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ اتنی کم قیمت پر اپنی روزی کے ذریعے کو نہیں بیچ سکتا۔

سلیمہ نے اسے بالآخر پانچ سو روپوں پر راضی کر لیا۔

وہ رقم ادا کر کے جب اندر آئی تو مجیب غائب تھا۔

مجیبہ نے اُس کو بتایا کہ وہ پچھواڑے سے باہر نکل گیا تھا۔

سلیمہ کی کوکھ پکارتی رہی: "مجیب واپس آجاؤ . . ." مگر وہ ایسا گیا کہ پھر نہ آیا۔